کیا آپ معرفتِ الٰہی کے عملی راستے جانتے ہیں؟

مولانا وحید الدین خان

Sindhica
سنڌيڪا

کتاب نمبر:
484

کیا آپ معرفتِ الٰہی کے عملی راستے جانتے ہیں؟

مصنف: مولانا وحید الدین خان

پہلا ایڈیشن: 2020ء

کمپیوٹر لے آؤٹ: عبد اللہ جروار

مطبع: ذکی سنز پریس، کراچی

ناشر: سندھیکا اکیڈمی، کراچی

ہدیہ: 50 روپیہ

اسٹاکسٹ:

سندھیکا اکیڈمی B-24، نیشنل آٹو پلازہ مارسٹن روڈ کراچی 74400۔ فون: 021-32737290
سندھیکا بوک شاپ: شاپ نمبر 5، میزنائن فلور، حیدرآباد ٹریڈ سینٹر حیدر چوک۔ فون: 03133692150
سندھیکا بوک شاپ، 19 بلدیہ پلازہ گھنٹا گھر چوک سکھر۔ فون: 03352233803 / 03013431537
سندھیکا بوک شاپ، جی پی او روڈ پوسٹ آفیس کے پیچھے والی گلی لاڑکانہ۔ فون: 03313480039

کاٹھیاواڑ بوک اسٹور، اردو بازار کراچی۔ کتاب مرکز فریئر روڈ، عزیز کتاب گھر برُاج روڈ، بخاری کتاب گھر، قادری بوک اسٹور، مھران بوک اسٹور، مجاہد بوک اسٹور نیم کی چاڑھی سکھر۔ ھٹائی بوک ہاؤس حیدرآباد 03223011560۔ سندھی ادبی بورڈ بوک شاپ تلک چاڑھی حیدرآباد۔ شاہ لطیف بوک شاپ بھٹ شاہ۔ عثمانیہ لائبریری، چنیہانی کنڈیارو۔ نیشنل بوک اسٹور، نورانی بوک ڈیپو بندر روڈ، رابیل کتاب گھر اسٹیشن روڈ، رہبر بوک اکیڈمی رابعا سینٹر بندر روڈ لاڑکانہ۔ مدنی اسلامی کتب خانہ نئوں چوک دادو۔ حافظ بوک اسٹور مسجد روڈ، خیرپور میرس۔ المھران کتاب گھر، زاہد بوک ڈیپو سانگھڑ۔ سید ماس میگا اسٹور جیکب آباد۔ میمن بوک اسٹور شاہی بازار نوشہرو فیروز۔ سلیمان برادرس مسجد روڈ، عوامی بوک اسٹال مسجد روڈ، حافظ اینڈ کمپنی، لیاقت مارکیٹ نوابشاہ۔ دیدار بوک ڈیپو ٹنڈوالھیار۔ رفعت بوک ہاؤس ماتلی۔ مرچولال پریمی بدین۔ مکتبہ یوسفیہ میرپورخاص فون: 03003319565۔ عطار کتاب گھر بدین۔ مھران کتاب گھر عمرکوٹ۔ حافظ کتاب گھر کھپرو۔ سندھ کتاب گھر مورو۔ وسیم کتاب گھر لکھی در۔ سعید بوک اسٹور شکارپور۔ سومرا بوک اسٹور میھڑ، ساحر کتاب گھر میھڑ 03458948535۔ مکتبہ العصر گھوٹکی 03033695037

خط و کتابت کے لیے:

سندھیکا اکیڈمی

B-24، نیشنل آٹو پلازا مارسٹن روڈ کراچی 74400
فون: 021-32737290، ویب سائیٹ: www.sindhica.org
ای میل: sindhicaacademy@gmail.com

فہرست

معرفت مقصد انسانیت

علمانے معرفت کو واجب اول بتایا ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ معرفت مقصد انسانیت ہے۔ موت سے پہلے کی زندگی آغازِ معرفت کی زندگی ہے اور موت کے بعد کی زندگی تکمیل معرفت کی زندگی۔ موجودہ دنیا میں ایک انسان ابتدائی دریافت کے درجے میں خدا کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ آخرت کی دنیا میں وہ کامل دریافت کے درجے میں خدا کی معرفت حاصل کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ معرفتِ خداوندی ایک فکری عمل (Intellectual Process) ہے۔ یہ فکری عمل موجودہ دنیا میں شروع ہوتا ہے اور پھر وہ ابدی طور پر آخرت کی دنیا میں جاری رہے گا۔

قرآن کی سورہ الذاریات میں بتایا گیا ہے کہ جن اور انس کو صرف اللہ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے "وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" اس آیت میں عبادت سے مراد معرفت الٰہی ہے۔ آیت کی یہ تفسیر عبد اللہ بن عباس اور علی بن ابی طالب کے قول پر مبنی ہے۔

یہی معرفتِ الٰہی جن و انس کا مقصد تخلیق ہے، اس مقصد کا تقاضا تھا کہ جن و انس کو وہ صلاحیت کمال درجے میں عطا کی جائے جس کے ذریعے وہ اعلیٰ درجے میں معرفت خداوندی کو حاصل کر سکیں۔ چنانچہ جن وانس کو ایک طرف وہ اعلیٰ دماغی صلاحیت دی گئی جو اس عظیم مقصد کے لیے مطلوب تھی، اور اسی کے ساتھ خارجی اعتبار سے، ان کو وہ وسائل دئے گئے جو اس مقصد کی تکمیل میں مددگار بن سکیں۔

معرفت الٰہی کے لفظی معنی ہیں ادراک (Realisation) یعنی کسی چیز کو کامل درجے میں پہچاننا۔ معرفت کو دوسرے لفظوں میں شعوری دریافت (Intellectual Discovery) کہہ سکتے ہیں۔ یہ دریافت کسی وقتی واقفیت کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک لمبے سفر کا نام ہے۔

انسان کو جس خدا کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ اس کی صفت قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ اگر تمام درخت قلم بنادئے جائیں اور تمام موجود سمندروں اور مزید سمندروں کو روشنائی (Ink) بنادیا جائے اور پھر خدا کے کلمات کو لکھنا شروع کیا جائے تو تمام سمندر ختم ہو جائیں گے، لیکن خدا کے کلمات ختم نہ ہوں گے (لقمان، 27)۔ جس خدا کے کمالات اتنے زیادہ ہوں، اس کی دریافت ایک وقتی واقفیت سے نہیں ہو سکتی، یہ بلاشبہ دریافت کا ایک لامتناہی سفر ہے جس کا آغاز تو متعین ہو سکتا ہے، لیکن اس کا اختتام متعین نہیں۔

خدا کی معرفت کا یہ مطلب نہیں کہ مراقبہ (Meditation) کر کے تصور کی دنیا میں ذاتِ الٰہی کی جھلکیاں دیکھنے کی کوشش کی جائے۔ اسی طرح وجد (Ecstasy) بھی معرفت کے ہم معنی نہیں۔ معرفت ایک اعلیٰ شعوری حالت ہے جو تخلیقات الٰہیہ میں غور و فکر کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ قرآن کے مطابق، معرفت کی تعریف (Definition) یہ ہے کہ ایک بندہ، رب العالمین کو ان عظمتوں کے ساتھ دریافت کرے کہ وہی اس کے لیے اس کی ساری محبتوں کا مرکز بن جائے (البقرہ، 165)، اور اس کی خشیت کے جذبات تمام تر اُسی کے ساتھ وابستہ ہو جائیں (التوبہ، 18)۔

محبت اور خشیت دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایک بندہ جب تدبر اور تفکر کے ذریعے خالق کائنات کو اس کی صفات کمال کے ساتھ دریافت کرتا ہے تو اس کے دل میں بے پناہ حد تک اپنے رب کا اعتراف پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ جب وہ اس حقیقت کو دریافت کرتا ہے کہ دینے والا خدا ہے، اس کے سوا کوئی اور دینے والا نہیں تو اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر میں خدا کی رحمتوں سے محروم ہو جاؤں تو زمین و آسمان میں میرا کوئی ٹھکانہ نہ ہو گا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم (التین، 4) کے ساتھ پیدا کیا۔ اس کو وہ تمام دماغی صلاحیت عطا کر دی جس کے ذریعے وہ رب العالمین کی معرفت حاصل کر سکے۔ دوسری طرف، خارجی دنیا (Nature) کے اندر معرفت کے تمام اجزا مخفی صورت میں رکھ دیئے، اب انسان کا یہ کام ہے کہ وہ معرفت کے ان چھپے ہوئے اجزا کو دریافت کرے اور اعلیٰ معرفت کا تجربہ کر کے اپنے اندر ربانی شخصیت (Divine Personality) کی تعمیر کرے۔

ایمان ایک معرفت

قرآن کی سورہ الحجرات میں کچھ اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ (الحجرات، 14) یعنی اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ کہو کہ تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اسلام قبول کیا اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

دوسری طرف، قرآن کی سورہ المائدہ میں کچھ اور اہل ایمان کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے: "اور جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، اس سبب سے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان

لائے، پس تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ اور ہم کیوں نہ ایمان لائیں اللہ پر اور اس حق پر جو ہمیں پہنچا ہے۔ جب کہ ہم یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو صالح لوگوں کے ساتھ شامل کرلے۔ پس اللہ ان کو اس قول کے بدلے میں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ان باغوں میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہی بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کا" (المائدہ، 85-83)۔

ان دونوں آیتوں کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی حقیقت کیا ہے۔ وہ کون خوش نصیب لوگ ہیں جن کے ایمان کو اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت حاصل ہوگی اور وہ ابدی جنتوں میں داخل کئے جائیں گے، جہاں وہ کبھی نہ ختم ہونے والی خوشیوں اور راحتوں میں زندگی گزاریں گے۔

پہلی بات یہ کہ اللہ تعالیٰ کا مطلوب ایمان وہ ہے جو داخل القلب ایمان (الشعراء، 14) ہو، صرف زبان سے ایمان کے کلمات ادا کردینا وہ چیز نہیں جس کی بنا پر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے یہاں مومن یا صاحب ایمان شمار کیا جائے۔ زبان سے جو کلمہ ایمان ادا کیا جاتا ہے، وہ در حقیقت آدمی کی طرف سے قبولیت ایمان کا ایک لفظی اظہار ہے۔

خدا کے نزدیک، اصل مطلوب ایمان یہ ہے کہ ایمان کی حقیقت دل کی گہرائیوں میں داخل ہوجائے، وہ آدمی کے شعور کا سب سے زیادہ اہم حصہ بن جائے، اس کے ذریعہ آدمی کے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر ہونے لگے۔

دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان معرفت حق کا دوسرا نام ہے۔ آدمی جب ایمان کو اور اپنے خالق کو صحیح طور پر پہنچانے اور شعور کی گہرائیوں کے ساتھ وہ یہ جان لے کہ وہ صرف ایک عاجز بندہ ہے۔ ہر قسم کی برائیاں اور تمام قسم کے کمالات صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہیں، پھر یہ عمل اس کو اس حد تک متاثر کرے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے آگے ڈال دے، تو اسی گہرے ایمانی تجربے کا نام معرفت (Realization) ہے، اور یہ معرفت، ایمان کا آغاز ہے۔ ایمان جب تک حق کی گہری معرفت نہ بنے، اللہ کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں۔

اس عارفانہ ایمان کی ایک علامت یہ ہے کہ ایک آدمی کو اس کا تجربہ ہوتا ہے تو اس کی آنکھوں سے آنسو کا سیلاب بہہ پڑتا ہے۔ یہ تجربہ اس کی اندرونی شخصیت میں ایک زلزلہ پیدا کردیتا ہے۔ اس کے اندر ایک زبردست قسم کی روحانی ہلچل برپا ہوجاتی ہے۔ یہی گہرے آنسو گویا اس کے اندر برپا ہونے والے داخلی انقلاب کی تصدیق ہوتے ہیں۔ جس معرفت کے ساتھ آنسوؤں کی یہ تصدیق شامل نہ ہو، وہ معرفت حق، اللہ تعالیٰ کے یہاں معتبر نہیں۔

یہ ایمان کوئی سادہ بات نہیں، اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک کائناتی شہادت ہے۔ یہ حقائق خداوندی کو دیکھنے سے پہلے گویا اس کا مشاہدہ کرلینا ہے۔ یہ مجبورانہ اعتراف کا وقت آنے سے پہلے اس کا اختیارانہ اعتراف کرنا ہے۔ یہ اس خداوند ذوالجلال کے حق میں اپنی گواہی درج کرنا ہے جس کی گواہی ہر لمحہ خدا کے مقدس فرشتے کائناتی سطح پر انجام دے رہے ہیں۔

ایمان دراصل دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دینے کا فیصلہ ہے۔ یہ دنیا کی نعمتوں کے مقابلے میں آخرت کی نعمتوں کا طالب بنتا ہے۔ جو لوگ اپنے سارے دل اور اپنے سارے دماغ کے ساتھ اس طلب کا ثبوت دیں، وہی وہ روحیں ہیں جن کو جنت کے ابدی باغوں میں داخل کیا جائے گا، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہ کبھی اس سے باہر آنے کی تمنا نہ کریں گے (الکہف، 108)۔

کلمات رب کی دریافت

معرفت کیا ہے۔ معرفت یہ ہے کہ انسان حالت غیب میں اپنے رب کو پہچانے، وہ دیکھے بغیر اس کو دیکھ لے۔ معرفت دراصل یہ ہے کہ آدمی کو خدا کی موجودگی کا حسیاتی تجربہ ہونے لگے۔

ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے اور معرفت کے حصول کی بھی ایک قیمت ہے، وہ قیمت بنیادی طور پر یہ ہے کہ آدمی پردہ التباس (Element of Doubt) کو پھاڑ کر حقیقت اعلیٰ کو دیکھ سکے۔ پردہ التباس کو پھاڑنے میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو ہر قسم کے ڈسٹر یکشن (Distraction) سے بچائے، جو اپنے آپ کو کامل یکسوئی کے ساتھ معرفت کے حصول میں لگادے۔ ڈسٹر یکشن میں ہر وہ چیز شامل ہے جو آدمی کی توجہ کو مقصد اعلیٰ سے ہٹانے والی ہو۔ اس میں ہر قسم کے منفی جذبات بھی شامل ہیں۔ مثلاً نفرت، تعصب، فخر، احساس برتری، اور خواہش کی پیروی وغیرہ۔

انسان کو جو دماغ دیا گیا ہے، وہ بے پناہ صلاحیتوں کا حامل ہے، وہ کوئی عبث چیز نہیں ہے۔ وہ اس لیے ہے کہ آدمی دماغ کو ان فولڈ (Unfold) کرے اور اس کو حقائق ربانی کی دریافت کے لیے استعمال کرے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ کلمات رب (لقمان، 27) اتنے زیادہ ہیں جن کی کوئی حد نہیں۔ اسی کے ساتھ انسانی دماغ کے جو امکانات (Potential) ہیں، وہ بھی لامحدود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک فرد کے دماغ میں جتنے پارٹکل ہوتے ہیں، وہ پوری کائنات میں موجود پارٹکل کے برابر ہیں، انسان کو یہ غیر معمولی صلاحیت اس لیے دی گئی ہے کہ وہ اس کو استعمال کرکے معرفت اعلیٰ کو حاصل کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ جنت میں اہل جنت کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ (شغل فاکہ) یہ ہوگا کہ وہ لامحدود کلمات رب کو ابدی طور پر دریافت کرتے رہیں۔ موجودہ دنیا دراصل اس لیے ہے کہ آدمی اپنے آپ کو جنت کے اس لامحدود عمل کے لیے تیار (Prepare) کرے۔ جنت کی سب سے بڑی خوشی حصول معرفت کی خوشی ہے۔ حصول معرفت کا یہ سفر جنت میں ابدی طور پر جاری رہے گا۔ اس کے علاوہ جنت میں جو مادی نعمتیں ملیں گی، وہ دراصل ضیافت ربانی کے طور پر ملیں گی۔ (الفصلت،32)

معرفت کی پہچان

ماہ نامہ الرسالہ، ستمبر 2010 میں 12 صفحات پر مشتمل ایک طویل مقالہ چھپا ہے۔ اس کا عنوان یہ ہے: معرفت مقصد انسانیت۔ اس کو پڑھ کر ایک صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انہوں نے کہا کہ الرسالہ کا یہ مضمون مجھ کو بہت پسند آیا۔ اب یہ سوال ہے کہ معرفت کی پہچان کیا ہے، یعنی کوئی شخص کیسے یہ سمجھے کہ اس کو وہ چیز حاصل ہوئی ہے جس کو دین میں معرفت کہا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ قرآن میں اس کی پہچان بتادی گئی ہے اور وہ ذکر کثیر (الاحزاب، 41) ہے، یعنی بہت زیادہ خدا کو یاد کرنا۔ معرفت دراصل رب العالمین کی ڈسکوری ہے۔ جب رب العالمین کو ڈسکوری (دریافت) کسی کو معرفت کے درجے میں حاصل ہو جائے تو اس کے بعد اس کے اندر ایک گہرا ذہنی انقلاب آجاتا ہے۔ اب خدا ہی اس کی سوچ کا مرکز و محور بن جاتا ہے۔ ایسا انسان صبح و شام خدا کو یاد کرتا ہے، وہ ہر لمحہ اس کے بارے میں سوچتا ہے، وہ اسی کا چرچا کرتا ہے اور پرچارک بن جاتا ہے۔ یہی اس کے وجود کی سب سے زیادہ نمایاں پہچان بن جاتی ہے۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ کسی شخص کو اگر کوئی ایسی چیز مل جائے جس کو وہ بہت بڑی چیز سمجھتا ہو تو وہ خود اپنے فطری تقاضے کے تحت اس کا بہت زیادہ چرچا کرتا ہے۔ اس کو اس چیز کی یاد میں اتنی لذت ملتی ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ وہ اسی کے بارے میں سوچتا اور بولتا رہے۔

یہی معاملہ خداوند عالم کی معرفت کا ہے۔ جب کسی شخص کو دریافت کے درجے میں اللہ کی معرفت ہو جائے تو یہ معرفت اس کے ذہن پر چھا جاتی ہے۔ اپنے فطری تقاضے کے تحت، وہ اسی کے بارے میں سوچتا ہے، اسی کے بارے میں بولتا ہے، حتی کہ اپنی تنہائیوں میں وہ اسی کے تصور میں غرق رہتا ہے۔ اس کا ہر تجربہ اس کے لیے خدا کی معرفت میں ڈھل جاتا ہے۔ جب کسی انسان کا یہ حال ہو جائے تو یہ اس بات کی پہچان ہے کہ اس کو وہ ربانی رزق عطا ہوا ہے جس کو معرفت کہا جاتا ہے۔

معرفت کی قیمت

اعلیٰ معرفت بلاشبہ کسی انسان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ یہ دراصل اعلیٰ معرفت ہے جو انسان کو حیوان سے ممیز کرتی ہے۔ اعلیٰ معرفت کو حاصل کرنا، اتنا ہی ممکن ہے جتنا کہ کسی اور چیز کو حاصل کرنا۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی اس کی قیمت ادا کرے۔ ضروری قیمت ادا کئے بغیر اس دنیا میں کوئی چیز کسی کو نہیں ملتی، اور اسی طرح اعلیٰ معرفت بھی۔

اعلیٰ معرفت کے حصول کی قیمت کیا ہے، وہ صرف ایک ہے کہ معرفت کو اپنی زندگی میں اولین درجہ دینا اور بقیہ تمام چیزوں کو ثانوی بنادینا۔ جو عورت یا مرد یہ قیمت ادا کریں، وہ ضرور اعلیٰ معرفت کے درجے تک پہنچیں گے۔ اور جو لوگ یہ قیمت ادا نہ کریں، وہ کسی بھی حال میں اعلیٰ معرفت کے درجے تک نہیں پہنچ سکتے، خواہ کسی اور اعتبار سے انہوں نے کتنا ہی زیادہ عمل کیا ہو۔

اصل یہ ہے کہ زندگی میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں، جب کہ آدمی اپنے آپ کو دو تقاضوں کے درمیان پاتا ہے، دین کا تقاضا اور دنیا کا تقاضا۔ ایسے موقع پر آدمی اگر یہ کرے کہ وہ دین کے تقاضے کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے دنیوی تقاضے کی طرف جھک جائے، تو ایک بار ایسا کرنا بھی آدمی کے لیے ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔

اس طرح شیطان کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ آدمی کے سفر معرفت کو روک کر اس کو پیچھے کی طرف دھکیل دے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں اس طرح بیان کی گئی ہے: ”جو لوگ ڈر رکھتے ہیں، جب کبھی انھیں کوئی شیطانی خیال چھو جاتا ہے تو وہ فوراً چونک پڑتے ہیں، اور پھر اُسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے۔ اور جو شیطان کے بھائی ہیں، وہ ان کو گمراہی میں کھینچے چلے جاتے ہیں، پھر وہ کمی نہیں کرتے۔“ (الاعراف، 202-201)

حقیقت یہ ہے کہ معرفت کا سفر ایک مسلسل سفر ہے۔ ایک دن کے لیے بھی اگر آدمی نے اپنے سفر معرفت کو روکا تو وہ سالوں کے لیے پیچھے چلا جائے گا۔

معرفت کا آغاز

ایک عربی مثل ہے: لاادری، نصف العلم (میں نہیں جانتا، آدھا علم ہے) یعنی اپنی بے خبری کو جان لینا، علم کا نقطۂ آغاز (starting point) ہے۔ آدمی جب یہ جان لے کہ میں نہیں جانتا تو اس کے

بعد اس کے اندر جاننے کی اسپرٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ اسپرٹ آخر کار اس کو علم تک پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی ہے، وہ اس کے نہ جاننے کو جاننا بنا دیتی ہے۔ یہی معاملہ معرفت کا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے یہ دریافت کرے کہ وہ معرفت سے خالی ہے۔ اِس کے بعد اس کے اندر تلاشِ معرفت کا جذبہ پیدا ہو گا، جو آخر کار اس کو معرفت تک پہنچادے گا۔

علم کا آغاز روحِ تجسس (sprit of enquiry) ہے۔ یہی اسپرٹ معرفت کے لیے بھی ضروری ہے۔ آدمی کو سب سے پہلے یہ جاننا چاہیئے کہ معرفت کے بغیر وہ اندھیرے میں ہے۔ معرفت کے ساتھ جینا روشنی میں جینا ہے، اور معرفت کے بغیر جینا اندھیرے میں جینا۔ معرفت کے بغیر انسان کے لیے صرف ناکامی ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ معرفت آدمی کو بر تر سطح پر جینے والا بناتی ہے۔ معرفت والا آدمی اِس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ حقیقتوں کو بے آمیز (as it is) انداز میں سمجھ سکے۔ معرفت آدمی کو فرشتوں کا ہم نشیں بناتی ہے۔ معرفت آدمی کو اِس قابل بناتی ہے کہ اُس کو خدا کا فیضان (inspiration) ملنے لگتا ہے۔ معرفت کسی انسان کو انسانِ کامل بناتی ہے۔ معرفت دنیا میں ہدایت کا ذریعہ ہے اور آخرت میں جنت ذریعہ۔

معرفت کسی انسان کے لیے اس کے سفر حیات کا صحیح آغاز ہے۔ معرفت کسی انسان کو بے شعور زندگی سے نکال کر باشعور زندگی کی طرف لے جانے کا ذریعہ ہے۔ معرفت کسی آدمی کو اِس قابل بناتی ہے کہ وہ بے خدا طرز زندگی سے نکل کر با خدا طرزِ زندگی کو اختیار کر سکے۔ معرفت کے ذریعے یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی اپنے اعلیٰ امکانات (potentials) کو دریافت کرے اور خدا کی مدد سے اس کو واقعہ (actual) بنائے۔ معرفت تکمیلِ علم کا ذریعہ ہے، اور تکمیلِ حیات کا ذریعہ بھی۔

معرفت کی زمین

ایک پودے کے اُگنے کے لیے زرخیز زمین (fertile land) درکار ہوتی ہے۔ صرف زرخیز زمین ہی میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہاں ایک پودا اُگے اور پھر بڑھتے بڑھتے وہ ایک ہرا بھرا درخت بن جائے۔ اِس قسم کا واقعہ کسی بنجر زمین (barren land) میں نہیں ہو سکتا۔ زرخیز زمین درخت کے اُگنے کے لیے موافق زمین ہے اور بنجر زمین درخت کے اگنے کے لیے غیر موافق زمین۔

یہی معاملہ معرفت کا بھی ہے۔ معرفت کا نشو و نما صرف ایک موافق انسان کی شخصیت میں ہوتا ہے۔ غیر موافق انسان کی شخصیت میں کبھی معرفت کا نشو و نما نہیں ہوتا۔ اِس موافق شخصیت کو ایک

لفظ میں، مثبت شخصیت (positive personality) کہا جا سکتا ہے۔ اِسی طرح غیر موافق شخصیت کو ایک لفظ میں منفی شخصیت (negative personality) کہنا صحیح ہو گا۔ جو آدمی چاہتا ہو کہ اس کے اندر معرفت کا باغ پرورش پائے، اس کو چاہیے کہ وہ ہر قیمت پر اپنے آپ کو منفی شخصیت بننے سے بچائے۔ وہ اپنے آپ کو مثبت شخصیت بنائے، خواہ اُس کو اِس کی کوئی بھی قیمت دینی پڑے۔

منفی شخصیت والا انسان وہ ہے جو ردعمل کی نفسیات میں جیتا ہو، جو ماحول کا اثر قبول کرتا رہے، جو اپنی شعوری ناپختگی (immaturity) کی بنا پر خارجی واقعات سے متاثر ہوتا رہے۔ ایسا انسان منفی شخصیت والا انسان ہے۔ ایسے انسان کو کبھی معرفت کا رزق نہیں مل سکتا۔

مثبت شخصیت والا انسان وہ ہے جو اپنی شعوری پختگی (maturity) کی بنا پر اِس قابل ہو کہ وہ خارجی حالات سے اوپر اٹھ کر زندگی گزارے، جو خارجی اثرات سے غیر متاثر رہ کر اپنی ذہن کی تشکیل کر سکے، جو منفی تجربات کو مثبت سبق (positive lesson) میں تبدیل کر سکے۔

یہی مثبت شخصیت ہے۔ اِسی مثبت شخصیت کو خدا کی توفیق سے یہ موقع ملتا ہے کہ وہ مثبت انداز میں سوچے، اُس کو معرفت کی دریافت ہوتی رہے۔ اس کے اندر عارفانہ شخصیت کی تشکیل کا عمل (process) جاری رہے۔ معرفت کا حصول صرف مثبت شخصیت کی زمین پر ہوتا ہے، نہ کہ منفی شخصیت کی زمین پر۔

معرفت کی روشنی

آپ کے آفس میں ٹیوب لائٹ ہے، لیکن اس کا کنکشن پاور ہاؤس سے قائم نہیں ہوا ہے تو آپ کی ٹیوب لائٹ میں کوئی روشنی نہیں ہو گی، وہ بے نور پڑی رہے گی۔ لیکن جب اس کا کنکشن پاور ہاؤس سے قائم ہو تو اچانک وہ روشن ہو جاتی ہے۔

یہ مادی واقعہ اُس روحانی حقیقت کی مثال ہے جس کو معرفت (realization) کہا جاتا ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان اگر ربط قائم نہ ہو تو اس کا وجود معرفت سے بے بہرہ رہے گا، لیکن جب خدا اور بندے کے درمیان ربط قائم ہو جائے تو اس کے بعد اچانک ایسا ہوتا ہے کہ بندے کا دل و دماغ معرفت کی روشنی سے منور ہو جاتا ہے۔

خدا کے تخلیقی نقشہ (creation plan of God) کے مطابق، انسان کی حیثیت اِس دنیا میں

پانے والے (taker) کی ہے۔ اس کے مقابلے میں، خدا کی حیثیت دینے والے (giver) کی ہے۔ انسان ہر اعتبار سے ایک محتاج مخلوق ہے۔ وہ اپنی کسی بھی حاجت کو خود سے پورا نہیں کر سکتا۔ یہ صرف خدا ہے جو اس کی تمام حاجتوں کو پورا کرنے والا ہے۔ انسانی شخصیت کا یہ احتیاطی پہلو انسان کو مسلسل طور پر فقدان کے احساس میں مبتلا رکھتا ہے۔

یہ احساسِ فقدان انسانی شخصیت کا ایک ایسا لازمی حصہ ہے جو کبھی اُس سے جدا نہیں ہوتا۔ جو آدمی شعوری طور پر اِس فقدان سے باخبر ہوجائے، وہ متلاشی (seeker) بن جاتا ہے۔ اور جو آدمی اپنی ذات کے اِس فقدان سے باخبر نہ ہو، وہ ہمیشہ محرومی کے احساس میں مبتلا رہتا ہے۔

خدا کی معرفت انسان کی اِسی تخلیقی کمی کا جواب ہے۔ خدا کی معرفت کے سوا کوئی اور چیز انسان کی اِس کمی کو پورا کرنے والی نہیں۔ جس طرح بلب پاور ہاؤس سے کنکشن کے بغیر روشن نہیں ہوتا، اِسی طرح معرفت کے بغیر کسی انسان کی زندگی ایک بے نور زندگی ہوتی ہے، کوئی اور چیز اس کی شخصیت کو منور کرنے والی نہیں۔

ارتقاپذیر معرفت

ایک مغربی مبصر نے لکھا ہے کہ ہر دن صبح کو جب سورج کی پہلی کرن تمہارے کمرے میں داخل ہو تو تم اچھل کر بستر سے اٹھو اور کہو کہ ایک اور نئی شاندار صبح:

Wonderful, what a new bright sun!

خدا جو سورج کا خالق ہے، اس کی معرفت بلاشبہ سورج سے بے شمار گنا زیادہ ہے۔ جس انسان کو خدا کی دریافت ہوجائے، وہ ہر صبح وشام خدا کی نئی تجلّی کو دریافت کرے گا، اس کی معرفتِ خدا ربانی تجلیات کا ایک لامتناہی سفر بن جائے گی۔

معرفت پتھر کی طرح کوئی جامد چیز نہیں ہے، معرفت درخت کی مانند ایک نموپذیر چیز ہے۔ ایک چھوٹا سا بیج بڑھتے بڑھتے ایک سرسبز درخت بن جاتا ہے۔ یہی معاملہ معرفت کا بھی ہے۔ معرفت کا آغاز اقرارِ ایمان سے ہوتا ہے۔ اِس کے بعد مطالعہ اور غور وفکر کے ذریعہ یہ اقرارِ ایمان ترقی کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ معرفت کا ایک ہرا بھرا درخت، بلکہ معرفت کا ایک پورا باغ بن جاتا ہے۔ معرفت کے ارتقا کا یہ سلسلہ مسلسل جاری رہتا ہے، آدمی کی موت سے پہلے وہ ختم نہیں ہوتا۔

معرفت، خدا کی نشانیوں (آلاء)(wonders of God) کی دریافت کا نام ہے۔ خدا کے آلاء بے شمار ہیں، اِس لیے خدا کی معرفت بھی ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سفر ہے۔ ہمیشہ نئی نئی دریافتوں کے ذریعہ یہ سفر مسلسل طور پر جاری رہتا ہے۔ موت اِس سفر کا خاتمہ نہیں۔ موت کے بعد اہل ایمان کے لیے معرفت کا سفر مزید اضافے کے ساتھ جاری رہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اہلِ جنت کے لیے سب سے زیادہ لذیذ تجربہ یہی ہو گا کہ وہ معرفت کے باغوں میں جئیں گے۔ وہ معرفت کی ہواؤوں میں سانس لیتے رہیں گے۔ یہی بلاشبہ جنت کا سب سے زیادہ لذیذ عطیہ ہو گا۔

معرفت کا سفر

گورنمنٹ سروس میں ایک ضابطہ ہے جس کو بریک اِن سروس(Break in Service) کہا جاتا ہے۔ اگر آپ گورنمنٹ سروس میں ہوں اور آپ بیس سال تک سروس کرتے رہیں، اس کے بعد اچانک آپ بلا سبب اور بلا اجازت ڈیوٹی پر نہ آئیں تو آپ کی ساری سینئرٹی(Seniority) ختم ہو جائے گی، آپ پیچھے لوٹ کر دوبارہ وہاں پہنچ جائیں گے، جہاں سے آپ نے سروس شروع کی تھی۔ اس معاملے کو اصطلاح میں بریک ان سروس کہا جاتا ہے۔

یہی معاملہ معرفت(Realization of God) کے سفر کا بھی ہے۔ اگر آپ معرفت کا سفر شروع کریں اور ایک مدت تک آپ مسلسل اس پر چلتے رہیں، پھر آپ ایک عذر(Excuse) لے کر وقتی طور پر معرفت کے سفر کو روک دیں، تو یہ رکنا صرف ایک وقتی رکنا نہ ہو گا، بلکہ وہ بریک اِن معرفت کے ہم معنٰی بن جائے گا، یعنی آپ پیچھے لوٹ کر دوبارہ اس ابتدائی مقام پر پہنچ جائیں گے جہاں سے آپ نے اپنا سفر معرفت شروع کیا تھا۔

آدمی پر حقیقت کھلتی ہے اور وہ معرفت کا مسافر بن جاتا ہے، پھر درمیان میں کچھ غیر متعلق تقاضے پیش آتے ہیں، جن کو عذر بنا کر آدمی اپنے سفر معرفت کو روک دیتا ہے۔ مثلاً خاندانی تقاضا، مادی منفعت کا تقاضا، ذاتی، رجحان کا تقاضا وغیرہ۔

ایسے موقع پر آدمی کو چاہئے کہ وہ اس قسم کے کسی تقاضے کو ہرگز اپنے لیے عذر نہ بنائے۔ وہ دوسرے تمام تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے معرفت کے سفر کو جاری رکھے۔ ایسا ہی شخص منزل تک پہنچے گا اور جس آدمی نے کسی غیر متعلق تقاضے کو لے کر اس کو اپنے لیے عذر بنالیا تو وہ اس کے

لیے بریک ان معرفت کا واقعہ بن جائے گا۔

یہ ایک نہایت سنگین معاملہ ہے۔ معرفت حق کے مسافر کو ایسی غلطی کبھی نہیں کرنا چاہیے، ورنہ وہ ایسے نقصان سے دوچار ہو گا جس کی تلافی دوبارہ ممکن نہیں۔

آزمائش کیوں

ایک حدیث قدسی ان الفاظ میں آئی ہے: إِنَّ الْعَبْدَ يَدْعُواللهَ وَهُوَ يُحِبُّهُ، فَيَقُولُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ يَا جِبْرِيلَ اقْضِ لِعَبْدِي هَذَا حَاجَتَهُ، وَأَخِّرْهَا فَإِنِّي أُحِبُّ أَلَّا أَزَالَ أَسْمَعُ صَوْتَهُ (المعجم الاوسط الطبرانی، حدیث نمبر 8442)۔ یعنی بندہ جب اپنے رب کو پکارتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتا ہے تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے جبریل، میرے بندے کی حاجت پوری کرنے میں جلدی نہ کر، مجھے محبوب ہے کہ میں اس بندے کے آواز کو برابر سنوں۔

اس روایت میں صوت (Voice) کا لفظ سادہ طور پر صرف آواز کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ وسیع تر اعتبار سے، کلام کے معنی میں ہے۔ یہ صوت اس مومن کے بارے میں ہے جو اللہ کے قانون کے مطابق، آزمائش سے دوچار ہو۔ اس تجربے سے اس کا دل تڑپ اٹھے۔ اس کے ذہن میں ربانی افکار کا طوفان برپا ہو جائے۔ وہ اپنے عجز اور اللہ کی کبریائی کو دریافت کرے۔ اس کے نتیجے میں اس کی روح کے اندر ایک نیا طوفان برپا ہو جائے۔

ایسے موقع پر ایک مومن کی زبان سے جو کلمات نکلتے ہیں، وہ انوکھے کلمات ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کی عظمت (Glory of God) کی نئی دریافت کے ہم معنیٰ ہوتے ہیں۔ ایسا مومن اس خاص لمحہ میں پوری کائنات کے لیے قابل رشک بن جاتا ہے۔ اس وقت وہ اللہ کا ایسا ذکر کرتا ہے جس سے زمین اور آسمان بھی عاجز ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک تخلیقی نوعیت کا اعلیٰ ربانی ذکر ہوتا ہے۔

آزمائش مومن کے لیے ایک ربانی تجربہ ہوتی ہے۔ آزمائش مومن کی حساسیت (Sensitivity) میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ اس وقت اس کی زبان سے ذکر و دعا کے جو الفاظ نکلتے ہیں، وہ صرف معلوم الفاظ کی تکرار نہیں ہوتے، بلکہ وہ تخلیقی نوعیت کی دعا ہوتی ہے۔ اس وقت وہ اپنے رب کو ایسے الہامی الفاظ میں پکارنے لگتا ہے جس کو خود اس نے بھی اس سے پہلے نہیں جانا تھا۔ علم جب تجربہ بن جائے اور الفاظ جب حساسیت میں ڈھل جائیں، اس وقت مومن کی زبان سے جو کلمات نکلتے ہیں، وہ کلمات اتنے اعلیٰ ہوتے ہیں کہ خود اللہ کو اس کا سننا محبوب بن جاتا ہے۔

انسان ایک استثنائی مخلوق

پیغمبر اسلام ﷺ کا ایک ارشاد حدیث کی مختلف کتابوں میں آیا ہے۔ اس کے مطابق، آپ نے کہا: خَلَقَ اللهُ آدَمَ عَلىٰ صُورَتِهِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6227؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 2612) یعنی اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جسمانی شکل وصورت کے اعتبار سے، انسان خدا کے مانند ہے۔ یہاں "صورت" سے مراد صفات (Attributes) ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو محدود طور پر وہ صفات عطا فرمائی ہیں جو اللہ کی ذات میں اپنے کمال درجے میں موجود ہیں۔

انسان پوری کائنات میں ایک استثنائی مخلوق ہے۔ انسان ایک زندہ وجود ہے۔ انسان وہ واحد مخلوق ہے جس کو ایک جامع شخصیت (Personality) عطا ہوئی ہے۔ انسان سوچتا ہے، انسان دیکھتا ہے، انسان سنتا ہے، انسان منصوبہ بند عمل کرتا ہے، انسان اپنے حواس خمسہ کے ذریعہ چیزوں سے انجوائے کرسکتا ہے۔ اس قسم کی استثنائی خصوصیات ہیں جو پوری کائنات میں صرف انسان کا حصہ ہیں۔

انسان کو یہ استثنائی عطیات اس لیے دیے گئے ہیں کہ وہ استثنائی عمل کا ثبوت دے۔ یہ استثنائی عمل خالق کی شعوری معرفت ہے۔ اس طرح خداوند ذوالجلال نے انسان کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ معرفت کے درجے میں خدا کو دریافت کرے۔ وہ غیب کی حالت میں خدا کو دیکھے۔ وہ اختیار رکھتے ہوئے اپنے آپ کو خدا کے آگے بے اختیار کرلے۔ مجبوری کے بغیر وہ اپنے آپ کو خدا کے آگے سرینڈر کردے۔ وہ اپنے شعور کو بیدار کرکے اپنا ذہنی ارتقا کرے، وہ ذاتی دریافت کے درجے میں سچائی کو پائے۔ وہ سجدہ معرفت کی سطح پر خدا کے آگے جھک جائے۔ وہ پورے عالم فطرت کو اپنی روحانی غذا بنالے۔ وہ اپنی شخصیت کا ارتقا اس طرح کرے کہ وہ خداوند ذوالجلال کے پڑوس میں جگہ پانے کا مستحق بن جائے۔ جو آدمی اپنے اندر اس قسم کی شخصیت (Personality) نہ بنا سکے، وہ صرف انسان نما حیوان ہے، اس کی کوئی قیمت خدا کے یہاں نہیں۔

ارتقا کے تین درجے

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے کہا: النَّاسُ مَعَادِنُ كَمَعَادِنِ الْفِضَّةِ وَالذَّهَبِ خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقِهُوا (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2638)۔ یعنی انسان دھات کی مانند

ہیں، جیسے سونے اور چاندی کی دھات۔ جاہلیت میں جو بہتر ہیں، وہی اسلام میں بھی بہتر ہیں، جب کہ وہ اپنے اندر سمجھ پیدا کریں۔

اس حدیث میں انسان کے فکری ارتقا کے مراحل کو بتایا گیا ہے۔ ایک درجہ فکری وہ ہے جس پر انسان پیدا ہوتا ہے۔ دوسرا درجہ فکری وہ ہے جو انسان خود اپنی کوششوں سے بناتا ہے۔ تیسرا درجہ معرفت کا درجہ ہے۔ معرفت کے درجے میں پہنچ کر انسان اپنے ارتقا کی آخری منزل کو پالیتا ہے، یعنی وہ درجہ جس کا دوسرا نام اسلام ہے۔

اس اعتبار سے انسان کی مثال دھات (Metal) جیسی ہے۔ لوہا زمین سے نکلتا ہے۔ ابتدائی حالت میں وہ خام لوہا (Ore) ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کو پگھلا کر صاف کیا جاتا ہے۔ اب وہ ترقی پا کر اسٹیل بن جاتا ہے۔ اس کے بعد مزید صنعتی مراحل سے گزرتا ہے، یہاں تک کہ وہ باقاعدہ مشین کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ یعنی پہلے مرحلے میں خام لوہا، دوسرے مرحلے میں اسٹیل اور تیسرے اور آخری مرحلے میں مشین۔

یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو گویا کہ وہ فطرت کی کان (Mine) سے نکل کر باہر کی دنیا میں آتا ہے۔ اس کے بعد وہ بڑا ہوتا ہے اور اپنی سوچ کو عمل میں لاتا ہے۔ وہ تعلیم و تربیت کے مراحل سے گزرتا ہے۔ اس طرح پختگی کی عمر میں پہنچ کر وہ ایک باقاعدہ انسان بن جاتا ہے۔ یہ انسانی وجود کا درمیانی مرحلہ ہے۔ اس کے بعد اگر وہ اپنی عقل کو صحیح رخ پر استعمال کرے تو وہ معرفت حق کے درجے میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ وہ درجہ ہے جب کہ کوئی پیدا ہونے والا، کمال انسانیت کے مرحلے میں پہنچ کر عارف باللہ کا مقام حاصل کرلیتا ہے۔ ان تین ارتقائی مراحل کو حسب ذیل صورت میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

- پیدائشی شخصیت (Bron Personality)
- تیار شدہ شخصیت (Developed Personality)
- عارفانہ شخصیت (Realized Personality)

پیدائشی شخصیت، خدا کی دی ہوئی شخصیت ہوتی ہے۔ پیدائشی شخصیت کے اعتبار سے ہر آدمی یکساں ہوتا ہے۔ صلاحیت کے اعتبار سے اگرچہ ایک انسان اور دوسرے انسان میں ہمیشہ فرق ہوتا ہے، لیکن اس فطری فرق کے باوجود تمام انسان امکانی استعداد (Potential Capacity) کے اعتبار سے یکساں حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔

اسی بات کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَأَحَبُّ إِلَى اللهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَعِيفِ وَفِي كُلٍّ خَيْرٌ احْرِصْ عَلَى مَا يَنْفَعُكَ وَاسْتَعِنْ بِاللهِ وَلَا تَعْجَزْ وَإِنْ أَصَابَكَ شَيْءٌ فَلَا تَقُلْ لَوْ أَنِّي فَعَلْتُ كَانَ كَذَا وَكَذَا وَلَكِنْ قُلْ قَدَرُ اللهِ وَمَا شَاءَ فَعَلَ فَإِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2664)۔ یعنی "قوی مومن، اللہ کے نزدیک ضعیف مومن سے زیادہ بہتر اور پسندیدہ ہے، اور ہر ایک میں خیر ہے۔ جو چیز تمہارے لیے نافع ہو، اس کے تم حریص بنو اور اللہ سے مدد چاہو اور عاجز نہ ہو۔ اور اگر تمہارے خلاف کوئی بات پیش آئے تو یہ نہ کہو کہ کاش، میں نے ایسا اور ایسا کیا ہوتا۔ بلکہ یہ کہو کہ یہ خدا کا تقدیری نتیجہ تھا اسی نے جو چاہا کیا۔ کہ "اگر" کہنا شیطان کے عمل کا دروازہ کھولتا ہے۔"

اس حدیث میں مومن سے مراد انسان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان اگر اپنے اندر ایک اعتبار سے کمی محسوس کرے تو اس کو مایوس نہیں ہونا چاہیے، کیوں کہ دوسرے اعتبار سے اس کے اندر کوئی اور صفت زیادہ ہوگی، انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے خداداد صلاحیت کو دریافت کرے اور حوصلہ مندانہ انداز میں اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔ جدوجہد حیات کے دوران اگر اس کو کوئی نقصان پہنچے تو اس کو یقین کرنا چاہیے کہ اس منفی تجربے میں بھی کوئی مثبت فائدہ شامل ہوگا۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے ہر منفی تجربے سے مثبت سبق لے وہ کسی بھی حال میں پست ہمتی کا شکار نہ ہو۔

اسی طرح آدمی اپنی شخصیت کی تعمیر کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنا محاسبہ کرکے اپنی کنڈیشننگ کو دور کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنے شعور کو بیدار کرکے اپنے اندر ایسی شخصیت کی پرورش کرتا رہتا ہے جس کے اندر قبول حق کی صلاحیت موجود ہو جس کے اندر وہ صلاحیت ہو جس کو پیغمبر کی ایک دعا میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: اَللّٰهُمَّ، أَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَه، وَأَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَه (تفسیر ابن کثیر، 1/ 427)، وَأَرِنَا الْأَشْيَاءَ كَمَا هِيَ (تفسیر الرازی، 1/ 119) یعنی اے اللہ تو مجھے حق کو حق کے روپ میں دکھا، اور اس کی پیروی کو توفیق دے۔ اور اے اللہ، تو مجھے باطل کو باطل کے روپ میں دکھا، اور تو مجھے اس سے بچنے کو توفیق عطا فرما۔ اور اے اللہ، تو مجھے چیزوں کو ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں۔

یہی وہ انسان ہے جس کو ہم نے اوپر کی تقسیم میں تیار شدہ شخصیت (Developed Personality) کا نام دیا ہے۔ وہی آدمی دانش مند آدمی ہے جو اپنے اندر اس قسم کی شخصیت کی تعمیر کرے۔ جہاں تک فطری وجود کی بات ہے، ہر انسان کو فطری وجود کا عطیہ خالق کی طرف سے یکساں طور پر ملتا ہے، لیکن اس کے بعد اپنے آپ کو ایک تیار شدہ شخصیت بنانا، یہ ہر انسان کا خود اپنا

عمل ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے خام لوہا فطرت کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے، لیکن اس خام لوہے کو اسٹیل اور مشین میں تبدیل کرنے کا عمل انسان کارخانے میں انجام پاتا ہے۔

اسی خود تیاری (Self- Perparation) کے عمل پر اگلے ارتقائی مرحلے کا انحصار ہے۔ جو لوگ خود شناس بنیں، جو لوگ اپنا بے لاگ محاسبہ کرتے رہیں، جو لوگ اپنی کمیوں کو ڈھونڈ کر اپنی ڈی کنڈیشننگ کریں، جو لوگ ہر قیمت کو ادا کرتے ہوئے اپنے "خام لوہے" کو "اسٹیل" بنانے کا کام کریں، جن لوگوں کا یہ حال ہو کہ وہ انانیت اور کبر اور لالچ اور حسد اور غصہ اور انتقام جیسے منفی جذبات کا کبھی شکار نہ بنیں، جو کہ شخصیت کی تعمیر میں ایک مہلک رکاوٹ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خلاصہ یہ جو لوگ مسلسل طور پر اپنے اوپر تزکیہ کا عمل جاری کیے ہوئے ہوں، وہی لوگ ہیں جو خدا کی توفیق سے حق کو دریافت کرتے ہیں اور اس کو پوری آمادگی کے ساتھ قبول کرلیتے ہیں۔

تزکیہ کے لفظی معنٰی ہیں، پاک کرنا (Purification) یہ ہر آدمی کی لازمی ضرورت ہے۔ یہ ہر آدمی کا مسئلہ ہے کہ وہ اپنے ماحول سے اثر قبول کرتا رہتا ہے، جس کو کنڈیشننگ (Conditioning) کہا جاتا ہے۔ اپنے جذبات اور خواہشات کے تحت، اس کی کچھ عادتیں بن جاتی ہیں۔ اپنے مفادات اور مصالح کے زیر اثر، شعوری یا غیر شعوری طور پر، اس کا اپنا ایک مزاج بن جاتا ہے۔ یہ تمام چیزیں آدمی کی روحانی ترقی میں رکاوٹ ہیں۔ ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے آدمی کو خود اپنا نگراں (Guard) بننا پڑتا ہے۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی غلطیوں کو نکالتا ہے۔ وہ ایک بے رحمانہ اصلاح (Merciless Deconditioning) کا عمل اپنے اوپر جاری کرتا ہے۔ یہ تزکیہ کی لازمی شرط ہے۔ اس کے بغیر کسی کا حقیقی تزکیہ نہیں ہو سکتا۔ بے رحمانہ ذاتی اصلاح کے بغیر تزکیہ نہیں، اور تزکیہ کے بغیر جنت نہیں۔

جو لوگ اپنے آپ کو مذکورہ مراحل سے گزاریں اور اپنی تیاری کے نتیجے میں سچائی کو پالیں، انہیں کو قرآن میں اَلنَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ (الفجر، 27) کہا گیا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے تخلیقی نقشے پر راضی ہوئے، جنھوں نے اپنے آپ کو اس نقشے پر ڈھال کر اپنے اندر مطلوب شخصیت کی تعمیر کی۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کی رضامندی پائیں گے اور خدا کے فضل سے جنت کے ابدی باغوں میں بسائے جائیں گے۔

تواضع ایک عظیم عبادت

حدیث میں آیا ہے: کُلُّ ابۡنِ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيۡرُ الۡخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ (سنن الترمذی، حدیث نمبر

2499)۔ یعنی ہر انسان خطاکار ہے، اور سب سے اچھا خطاکار وہ ہے جو خطا کے بعد توبہ کرے۔ اعتراف خطا، ایک عظیم عبادتی عمل ہے۔ یہ اعتراف خطا، خدا کے سامنے بھی ہوتا ہے اور انسان کے سامنے بھی۔ جب خدا کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کیا جائے تو اس کو توبہ کہا جاتا ہے اور یہی عمل جب انسان کے سامنے کیا جائے تو اس کا نام اعتراف خطا ہے۔

اصحاب رسول کی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ بہت زیادہ توبہ کرنے والے اور اعتراف کرنے والے تھے، حتیٰ کہ بہت سے ایسے واقعات ہیں جب کہ ایک صحابی نے کہا کہ مجھ سے غلطی ہوئی، مجھ کو معاف کرو۔ حالاں کہ خالص قانونی اعتبار سے اس کو دیکھا جائے تو وہاں صحابہ نے ایسی کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ ایسا کیوں ہے اس کا سبب یہ ہے کہ یہ کہنا کہ میں غلطی پر تھا، دراصل اپنی تواضع کو مستحکم (Established) کرنا ہے۔ اسلامی عقیدے کے مطابق، ہر انسان کے پاس ہر وقت خدا کے فرشتے موجود رہتے ہیں، جو اس کے ہر قول و عمل کا ریکارڈ تیار کرتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ بالکل فطری بات ہے کہ ایک سچا مومن اس بات کا حریص ہو کہ فرشتے اپنے ریکارڈ میں اس کو ایک متواضع انسان کی حیثیت سے درج کریں نہ کہ ایک سرکش انسان کی حیثیت سے۔

یہ جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ ہر مومن کے اندر وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر موجود رہتا ہے۔ اس بنا پر مومن طبعاً اس کو پسند نہیں کرتا کہ وہ فرشتوں کی نظر میں ایک سرکش، انسان دکھائی دے۔ کسی معاملے میں خواہ بظاہر اس کی غلطی نہ ہو، تب بھی اس کا متواضعانہ مزاج اس کی زبان سے اس طرح ظاہر ہوتا رہتا ہے کہ وہ بار بار یہ کہہ دیتا ہے کہ میں غلطی پر تھا۔ غلطی کا اعتراف نہ کرنے سے سرکشی کے جذبات کو تسکین ملتی ہے۔ اس کے برعکس، غلطی کا اعتراف مومن کی متواضعانہ نفسیات کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ بے اعترافی اگر سرکش انسان کی غذا ہے تو اعتراف اس مومن کی غذا ہے جو اپنے آپ کو ہمہ تن خدا کے آگے جھکائے ہوئے ہو۔

اسلام کیا ہے

اسلام کی لفظی معنیٰ ہیں: سب مشن (Submission)، یعنی سب مشن ٹو گاڈ۔ سب مشن دراصل انسان کی طرف سے خدا کے لیے اس فطری رسپانس کا نام ہے، جو خدا کی معرفت کے بعد انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ اسی سب مشن سے وہ زندگی بنتی ہے جس کو اسلامی زندگی کہا جاتا ہے۔

خدا کی معرفت کیا ہے۔ خدا کی معرفت اس ہستی کی معرفت ہے جس نے انسان کو پیدا کیا۔ جس نے انسان کو ایک ایسی شخصیت عطا کی جیسی شخصیت وسیع کائنات میں کسی اور کو عطا نہیں ہوئی، جس نے انسان کے لیے وسیع کائنات میں زمین جیسا استثنائی کرہ بنایا، جس نے ہماری دنیا میں وہ انوکھا سسٹم قائم کیا جس کو لائف سپورٹ سسٹم کہا جاتا ہے۔

اس کی یہ دریافت یہیں تک نہیں رکتی، بلکہ وہ دریافتوں کے ایک پراسس کی صورت میں اس کی زندگی میں شامل ہو جاتی ہے۔ اب وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو دریافت کرتا ہے۔ وہ اس حقیقت کو دریافت کرتا ہے کہ میں آزاد نہیں ہوں، بلکہ میں خدا کے حکم کے ماتحت ہوں۔ دریافت کا یہ پراسس (Process) آگے بڑھتا ہے۔ وہ اس کو بتاتا ہے کہ وہ آزاد نہیں ہے، بلکہ وہ خدا کے سامنے جواب دہ (Accountable) ہے۔ موت اس کی زندگی کا خاتمہ نہیں ہے، بلکہ موت کے بعد ایک اور زندگی شروع ہوتی ہے جہاں وہ خدا کے سامنے حاضر ہو جاتا ہے، تاکہ خدا اس کے ابدی مستقبل کے بارے میں اپنے آخری فیصلے کا اعلان کرے۔

یہ پراسس جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ دریافت کرتا ہے کہ زندگی کا خاتمہ یا تو ابدی جنت کی صورت میں ہونے والا ہے، یا ابدی جہنم کی صورت میں۔ یہ دریافت اس کو بے حد سنجیدہ بنا دیتی ہے۔ اب وہ اپنی زندگی کی نئی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ اب وہ ہر چیز کو ری ڈفائن (Redefince) کرتا ہے۔ پہلے اگر اس کی سرگرمیاں خود رُخی (Self- Oriented) تھیں تو اب اس کی تمام سرگرمیاں خدا رُخی (God- Oriented) بن جاتی ہیں۔ اسی طرز حیات کا نام اسلام ہے۔

ایک سنگین مغالطہ

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے دنیوی معاملات میں خوب عقل نکالتے ہیں، زیادہ سے زیادہ سوچتے ہیں، ہر پہلو سے سمجھ کر منصوبہ بندی (Planning) کرتے ہیں، لیکن دین کے معاملے میں ان کا طریقہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ یہاں وہ سمجھتے ہیں کہ کسی حضرت کی دعا لے لو، کسی درگاہ میں چلے جاؤ، کسی بزرگ کی زیارت کر لو، تسبیح کے دانے پر کچھ الفاظ پڑھ لو، کچھ رسمی اعمال (Rituals) کو دہرا لو اور پھر تمام دینی معاملات خود بخود درست ہو جائیں گے۔ مگر یہ دوطرفہ طریقہ سرتاسر بے بنیاد ہے۔ اس طریقے کا کوئی فائدہ کسی کو ملنے والا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آدمی جس طرح دنیا کے معاملات میں اپنی عقل لگاتا ہے، اسی طرح اس کو دین کے معاملے میں بھی اپنی عقل لگانا ہوگا۔ دین کے معاملے میں بھی اس کو اپنے شعور کی پوری طاقت استعمال کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر نہ کوئی شخص حقیقی معنوں میں دین دار ہوسکتا ہے اور نہ وہ جنت کا مستحق بن سکتا ہے۔

دین دار بننے کا عمل پوری معنوں میں، ایک شعوری عمل ہے۔ ہر عورت اور مرد کے لیے لازم ہے کہ وہ شعوری سطح پر دین کو دریافت کرے۔ وہ دین داری کو شعوری دین داری بنائے، نہ کہ رسمی دین داری۔ وہ دین کو پورے معنوں میں، اپنے دل ودماغ کا حصہ بنائے۔ وہ اپنی دینی زندگی کو بھی اسی طرح ایک باشعور زندگی بنائے جس طرح وہ اپنی دنیا کی زندگی کو ایک باشعور زندگی بنائے ہوئے ہے۔ اس معاملے میں کسی بھی شخص کا کوئی استثنا نہیں۔

خدا نے انسان کو جو سب سے بڑی چیز دی ہے، وہ اس کا عقل وشعور ہے۔ جو لوگ عقل وشعور کی برتر سطح پر دین کو نہ پائیں اور دین کو اختیار نہ کریں، وہ خدا کے یہاں بے دین قرار پائیں گے خواہ رسمی سطح پر بظاہر وہ دین دار کیوں نہ بنے ہوئے ہوں۔ دین داری ایک شعوری عمل ہے، نہ کہ صرف ایک رسمی عمل۔

ناشکری کے حالات میں شکر

قرآن میں آدم اور ابلیس کا قصہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ سجدہ نہ کرنے کے نتیجے میں ابلیس کو جب رحمت خداوندی سے محروم کیا گیا، اس وقت ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے کہا: قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ (الاعراف: 17-16) یعنی ابلیس نے کہا کہ چوں کہ تو نے مجھ کو گمراہ کیا ہے، اس لیے میں بھی لوگوں کے لیے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا۔ پھر میں اس پر آؤں گا ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے، اور تو ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر گزار نہ پائے گا۔

اس آیت میں گمراہ کرنے کا مطلب آزمائش (Test) میں ڈالنا ہے۔ ابلیس کا مطلب یہ تھا کہ میں نارمل حالات میں درست تھا، لیکن سجدے کا حکم میرے لیے آزمائش کا سبب بن گیا۔ اس آزمائش نے مجھے ناکام کر دیا اور میں تیری رحمت سے محروم ہو گیا۔ اب میں تمام انسانوں کے ساتھ

یہی معاملہ کروں گا، یہاں تک کہ انسانوں کی اکثریت آزمائش میں ناکام ہو جائے گی، وہ شکر کے بجائے ناشکری کے راستے پر چل پڑے گی۔

قرآن سے ثابت ہے کہ ابلیس کو انسان کے اوپر کوئی اختیار حاصل نہیں (النحل، 99) پھر وہ کس طرح انسانوں کو شکر سے دور کرے گا۔ اصل یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں ہمیشہ ناشکری کے اسباب ہوتے ہیں۔ ناشکری کے حالات میں شکر گزار بننے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی، ناشکری کے اسباب کے باوجود شکر گزار بننے کا آرٹ جانے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں ابلیس کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ انسان کو بہکا کر ناشکر گزار بنا دے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ناشکری کو شکر میں تبدیل نہیں کر پاتا۔ وہ ناشکری کے ہر واقعے کو عذر بناتا رہتا ہے، اس طرح وہ شکر کی سعادت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتا ہے۔

تلاوت قرآن

قرآن کی تلاوت وہ چیز ہے جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ ایمان والے وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جائیں تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ (الانفال، 2) دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ اس سبب سے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ پکار اُٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے، پس تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ (الانعام، 84-83)۔

قرآن براہ راست خدا کا کلام ہے۔ اس میں خداوندی جلال کی گرج ہے۔ اس میں عبدیت کے احساس کو جگانے والی بجلیاں ہیں۔ اس میں وہ نور ربانی ہے جو کسی کے اندر اترے تو اس کے پورے داخلی وجود کو روشن کر دے۔ اس میں وہ شعلہ حق ہے جو کسی قلب پر اترے تو وہ اس کو کوہ طور کی طرح ریزہ ریزہ کر دے۔ ایسے کلام کی تلاوت سادہ طور پر تکرار الفاظ کا نام نہیں ہوتی۔ وہ دل و دماغ میں آگ لگانے کے ہم معنی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کا بار بار پڑھنا شخصیت انسانی میں ایک انقلاب پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔

قرآن کی تلاوت سادہ طور پر ایک کتاب کی تلاوت نہیں ہے۔ یہ کلام الٰہی کا مطالعہ ہے۔ یہ گویا

بالواسطہ انداز میں خدا سے ہم کلام ہونا ہے۔ ایسی حالت میں تلاوت قرآن کے درمیان اس کے مطابق کیفیات کا ظہور ہونا چاہیے۔ اگر اس غیر معمولی کلام سے مطابقت رکھنے والی کیفیات آدمی کے اندر پیدا نہ ہوں تو سمجھا جائے گا کہ وہ غفلت میں مبتلا ہے، اس نے زندہ شعور کے ساتھ قرآن کو نہیں پڑھا۔

قرآن کو پڑھتے ہوئے ایسا ہونا چاہیے کہ آدمی کے اوپر خدا کی ہیبت طاری ہو۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے قریب محسوس کرنے لگے۔ قرآن کا پڑھنا اس کو خدا سے ملانے والا بن جائے۔ قرآن کو پڑھنا اس کے لیے خدا سے زندہ تعارف کے ہم معنی ہو۔ قرآن میں وہ ایک طرف اپنی عبدیت کو پالے اور دوسری طرف خدا کی معبودیت اور اس کے جلال کو۔

دعا عبادت ہے

حدیث میں آیا ہے کہ دعا عبادت کا مغز ہے: الدعاء مخ العبادۃ (الترمذی، حدیث نمبر 3771) بلکہ دعا ہی اصل عبادت ہے: الدعا ھو العبادۃ (الترمذی، حدیث نمبر 2969)۔ یہ بات قرآن و حدیث میں مختلف انداز میں بیان کی گئی ہے۔ دعا کا اصل عبادت ہونا عین فطری ہے۔ کیوں کہ آدمی جب خدا کے وجود کو اس کی صفات کمال کے ساتھ دریافت کرتا ہے تو اسی کے ساتھ وہ یہ بھی دریافت کرتا ہے کہ خدا کے مقابلہ میں وہ بالکل بے حقیقت ہے۔

خدا آقا ہے، میں بندہ ہوں۔ خدا دینے والا ہے، میں پانے والا ہوں۔ خدا قادر ہے، میں عاجز اور محتاج ہوں۔ یہ احساس اس کو فوراً ہی خدا کے سامنے دعا گو بنا دیتا ہے۔ دعا وہ سب سے بڑا رشتہ ہے جس کے ذریعہ بندہ اپنے رب سے مربوط ہوتا ہے۔ دعا خدا اور بندے کے درمیان اتصال کا ذریعہ ہے۔ انسان جو کچھ پاتا ہے دعا سے پاتا ہے، اور تمام اعمال کا مقصد آدمی کو خدا سے دعا کرنے والا بناتا ہے تاکہ وہ خدا سے پانے والا بن جائے۔ مثال کے طور پر قرآن میں رمضان کے روزہ کا حکم دینے کے بعد یہ آیت آئی ہے اور جب میرے بندے تم سے میری بابت پوچھیں تو میں قریب ہوں، پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں، تو چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں تاکہ وہ ہدایت پائیں (البقرہ، 186)۔

دعا صرف کچھ الفاظ کی تکرار نہیں ہے، دعا ایک عمل ہے، بلکہ دعا سب سے بڑا عمل ہے۔ جس

طرح حقیقی عمل کبھی بے نتیجہ نہیں رہتا اسی طرح حقیقی دعا کبھی بے نتیجہ نہیں رہتی۔

جب کوئی بندہ حقیقی دعا کرتا ہے تو وہ گویا اپنے معاملہ کو خدا کا معاملہ بنا دیتا ہے اور جب کوئی معاملہ خدا کا معاملہ بن جائے تو کوئی بھی نہیں جو اس کو پورا ہونے سے روک سکے۔

عقیدے کی طاقت

خدا پر عقیدہ انسان کو اس دنیا میں سب سے بڑا سہارا دیتا ہے۔ خدا پر عقیدہ، اعتماد (Conviction) کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ایک فارسی شاعر نے بجا طور پر کہا ہے:

دشمن اگر قوی است، نگہبان قوی تر است۔

یعنی مسئلہ اگر بڑا ہے تو مسئلے کو حل کرنے والا اس سے بھی زیادہ بڑا ہے۔

موجودہ دنیا مسائل کی دنیا ہے۔ یہاں ہر عورت اور مرد کو بار بار مسائل پیش آتے ہیں۔ بار بار ایسی صورت حال پیش آتی ہے جہاں آدمی اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگتا ہے۔

سفر حیات کے درمیان بار بار آدمی کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آگے کا راستہ بند ہے۔ بار بار انسان اس منفی احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ اس کے وسائل و ذرائع کی آخری حد آگئی، خود اپنے بل پر اس کے لیے اب اپنے مسئلے کو حل کرنا ممکن نہیں رہا۔ یہی وہ نازک مرحلہ ہے جب آدمی خدا کو پکارتا ہے۔ اس وقت خدا اس کی پکار کو سن کر اس کے عجز کی تلافی کا سامان فراہم کر دیتا ہے۔

جس آدمی کا خدا پر عقیدہ نہ ہو، وہ ایسے موقع پر مایوسی (Despair) کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ دل برداشتہ ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اب اس کے اندر آگے بڑھنے کی ہمت نہیں۔ ایسی حالت میں پہنچ کر آدمی ٹنشن (Tension) میں جینے لگتا ہے اور ٹنشن اپنے آپ میں ساری بیماریوں کی جڑ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ٹنشن سے زیادہ بڑا کوئی مسئلہ انسان کے لیے نہیں۔

لیکن جس آدمی کو خدا کے اوپر سچا یقین (Conviction) ہو، وہ کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہوتا۔ اس کو ہر صورت حال میں یہ یقین رہتا ہے کہ اس کا خدا ضرور اس کی مدد کرے گا۔ ایسا آدمی کامل یقین (Conviction) کے ساتھ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا خدا ضرور اس کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچا لے گا، اس کا خدا اُس وقت بھی ضرور اس کا ساتھ دے گا جب کہ دوسرے لوگ اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔

محبت الٰہی

قرآن میں اہل ایمان کی ایک بنیادی صفت ان الفاظ میں بتائی گئی ہے: وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ (البقرہ165) یعنی جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں، وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں۔ قرآن کی اس آیت میں اہل ایمان سے مراد اہل معرفت ہیں۔ جو شخص دریافت کے درجے میں خدا کو پائے، وہ ایک صاحب معرفت انسان بن جاتا ہے، اور جو انسان صاحب معرفت ہو، اس کے جذبات تمام تر خدا کے ساتھ وابستہ ہو جائیں گے۔ خدا اس کے قلب و دماغ کا واحد مرکز بن جائے گا۔

انسان اپنی محدودیت کی بنا پر موجودہ دنیا میں خدا کو نہیں دیکھتا، لیکن وہ خدا کی رحمتوں کا ہر آن تجربہ کرتا ہے اور یہی تجربہ محبت الٰہی کا اصل سرچشمہ ہے۔ آدمی کو اس دنیا میں جو کچھ ملا ہوا، وہ سب کا سب خدا کی رحمت ہے۔ آدمی جتنا زیادہ ان ملی ہوئی چیزوں پر غور کرے گا، اتنا ہی زیادہ خدا کے ساتھ اس کی محبت بڑھتی چلی جائے گی۔ خدا سے محبت کا سرچشمہ انعام کی دریافت ہے، نہ کہ منعم کا مشاہدہ۔

انھی کو کس نے پیدا کیا، خدا نے۔ انسان کو مختلف قسم کی اعلیٰ صلاحیتیں کس نے دیں، خدا نے۔ انسان کے لیے زمین جیسا ایک استثنائی سیارہ کس نے بنایا، خدا نے۔ انسان کے لیے یہاں لائف سپورٹ سسٹم کس نے قائم کیا، خدا نے۔ انسان کی تمام حاجتوں کی تکمیل کا انتظام کس نے کیا، خدا نے۔ انسان کو وہ دماغ کس نے دیا جو زمین پر رہتے ہوئے ساری کائنات کا احاطہ کر سکتا ہے، خدا نے۔

انھیں تمام انعام کے منعم کی دریافت کا نام معرفت ہے۔ کسی انسان کو جب یہ معرفت حقیقی معنوں میں حاصل ہو جائے تو اس کے اندر خدا سے محبت کا سرچشمہ ابل پڑتا ہے۔ اس کے دل کی گہرائیاں خدا کی محبت سے روشن ہو جاتی ہیں۔ خدا کی اطاعت بلاشبہ ایمان کا تقاضا ہے، لیکن یہ خدا سے محبت کی تصغیر ہے کہ اس کو صرف اطاعت کے معنیٰ میں لیا جائے۔ اطاعت، خدا سے تعلق کا صرف ایک قانونی اظہار ہے، جب کہ محبت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا پورا وجود خدا کی یاد میں ڈھل گیا۔ انسان اپنی پوری ہستی کے ساتھ خدا کا اعتراف کامل کرنے والا بن گیا۔

محبت الٰہی، اعتراف الٰہی

اللہ سے محبت ایمان کا جز ہے۔ اللہ سے محبت تمام الہامی مذاہب کی تعلیمات کا حصہ رہا ہے۔ مثلاً موجودہ بائبل، عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید، دونوں میں آیا ہے۔ خداوند اپنے خدا سے، اپنے

سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ:

You shall love the Lord your God with all your heart, with all your soul and with all your mind. (Matthew 22; 37, Deuteronomy 6: 5)

محبت الٰہی کسی پراسرار چیز کا نام نہیں۔ محبت الٰہی دراصل اعتراف الٰہی کا اعلیٰ درجہ ہے۔ ایک شخص جب اللہ کی دریافت کرتا ہے، جب وہ اللہ کی نعمتوں سے شعوری طور پر واقف ہوتا ہے، جب وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا وجود اور اس کی پوری زندگی اللہ کے انعامات (Blessings) سے بھری ہوئی ہے، اس وقت فطری طور پر اس کے اندر اللہ کے لیے شدید محبت (Strong Affection) کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اسی حب شدید کا نام محبت الٰہی ہے۔

محبت الٰہی، رب السماوات والارض سے محبت کا نام ہے۔ ایسی محبت کسی آدمی کے لیے صرف جذباتی تعلق کا نام نہیں ہوتا، اس کے ذریعے آدمی کی شخصیت میں ایک انقلاب پیدا ہوجاتا ہے۔ محبت الٰہی آدمی کے اندر تمام اعلیٰ صفات پیدا کرتی ہے۔ مثلاً مثبت سوچ (Positive thinking) انسانوں کے لیے شفقت، توکل علی اللہ اور اعتماد اور حوصلہ وغیرہ۔

محبت اللہ کی نسبت سے، معرفت کا اعلیٰ درجہ ہے۔ انسان کی نسبت سے معرفت آدمی کے اندر انسان دوست کردار (Human- friendly Behaviour) پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ دعوت الی اللہ بھی محبت الٰہی کا ایک اظہار ہے۔ جب کسی انسان کو اللہ سے محبت کا تعلق قائم ہوتا ہے تو فطری طور پر وہ چاہنے لگتا ہے کہ وہ اللہ کے بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچائے، یہاں تک کہ اللہ کا کوئی بندہ اپنے رب کی ابدی رحمتوں سے محروم نہ رہے۔

محبت الٰہی سے محرومی کیوں

قرآن کے مطابق، اعلیٰ معرفت صرف اس شخص کو ملتی ہے جس کو اللہ سے اعلیٰ تعلق قائم ہوجائے۔ اللہ سے اعلیٰ تعلق کی پہچان یہ ہے کہ انسان کو اللہ سے حب شدید (البقرہ، 165)، اور اللہ سے خوف شدید (التوبہ، 18) پیدا ہوجائے۔ جب کسی انسان کو اللہ کے ساتھ اس قسم کا گہرا تعلق پیدا ہوجائے تو اس کے اندر ذکر کثیر (الاحزاب، 41) کی صفت پیدا ہوجاتی ہے، یعنی اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنا، اللہ کے لیے بہت زیادہ سوچنا۔ اللہ کے ساتھ تعلق میں اگر ایک فی صد بھی کمی آجائے تو

ایسے انسان کو اللہ کی اعلیٰ معرفت حاصل نہیں ہو گی۔

یہود کا حال بعد کے زمانے میں یہ ہوا کہ ان کا گہرا تعلق اللہ سے نہ رہا، بلکہ اپنے احبار اور رُہبان سے ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں وہ اللہ کی اعلیٰ معرفت سے محروم ہو گئے۔ یہی موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا حال ہے۔ مسلمانوں کے ہر گروہ کے کچھ بڑے (Bigs) ہیں اور ان کا گہرا تعلق اپنے انہیں بڑوں سے ہے، نہ کہ خداوند ذوالجلال سے۔

اپنے ان بڑوں کو انہوں نے مقدس نام دے رکھے ہیں۔ مثلاً اکابر، اسلاف، مشائخ، بزرگان دین، وغیرہ۔ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے انہیں مفروضہ بڑوں سے گہرا قلبی تعلق رکھتے ہیں۔ اس گہرے قلبی تعلق کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے ان بڑوں کے خلاف علمی تنقید کو بالکل پسند نہیں کرتے۔

یہ غیر خدا کے ساتھ حب شدید کا تعلق قائم کرنا ہے اور جو لوگ کسی غیر خدا کے ساتھ حب شدید کی نفسیات میں مبتلا ہوں، وہ کبھی اللہ کی محبت کی توفیق نہیں پاتے۔ ایسے لوگوں کے حصے میں صرف رسمی عقیدہ آتا ہے، نہ کہ اعلیٰ ایمان باللہ، جو آدمی کو اعلیٰ معرفت تک پہنچانے والا ہو۔ محبت الٰہی کی ایک قیمت ہے، اور یہ قیمت ادا کئے بغیر کسی کو اللہ کی محبت حاصل نہیں ہو سکتی۔

محبت الٰہی کی قیمت

قرآن کی سورہ الاحزاب میں فطرت (Nature) کے ایک قانون کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ (33 :4) یعنی اللہ نے کسی آدمی کے سینے میں دو دل نہیں رکھے:

God has not placed two hearts in any man's body.

اس قانون فطرت کا یہ نتیجہ ہے کہ انسان کے دل میں نفرت اور محبت دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ اگر انسان کے اندر نفرت کا جذبہ پیدا ہو جائے تو محبت کا جذبہ اس کے اندر سے نکل جائے گا۔ اسی طرح جو انسان محبت کرنے والا بن جائے، اس کے اندر سے دوسروں کے خلاف نفرت کا جذبہ ختم ہو جائے گا۔ یہ ایک سنگین مسئلہ ہے اور اس معاملے میں ہر ایک کو بے حد محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔

انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اللہ سے شدید محبت کرنے والا بنے (البقرہ، 165 :2)۔ اس محبت کے بغیر کوئی شخص خدا کے اعلیٰ عنایات کا مستحق نہیں بن سکتا۔ مگر اس محبت کی ایک لازمی قیمت ہے،

وہ قیمت یہ ہے کہ انسان کسی بھی حال میں اپنے اندر نفرت کے جذبات آنے نہ دے۔ وہ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی ہر شکایت کو بھلا لے، وہ ہر غلطی کو معاف کرے، وہ ہر ظلم پر صبر کرے، وہ ہر ناپسندیدہ بات کو نظر انداز کرے، غرض وہ ہر قیمت کو ادا کرکے اپنے آپ کو نفرت سے دور رکھے۔ یہی محبت الٰہی کی قیمت ہے، جو آدمی یہ قیمت ادانہ کرے، وہ محبت الٰہی کی سعادت سے محروم رہے گا۔

عام طور پر لوگ یہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی نفرت کے لیے ایک عذر (Excuse) تلاش کرلیتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ میری نفرت فلاں سبب سے ہے، اور جہاں یہ سبب پایا جاتا ہو، وہاں کوئی شخص نفرت سے بچ نہیں سکتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ محبت الٰہی کے معاملے میں ہر عذر ایک جھوٹا عذر ہے۔ اس معاملے میں کوئی بھی عذر قابل سماعت نہیں۔ اس معاملے میں کسی عذر کو اپنے لیے عذر بنانا، صرف اس قیمت پر ہوگا کہ ایسا شخص خدا کی محبت سے محروم ہو کر رہ جائے۔

اللہ سے محبت

قرآن کی سورہ البقرہ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ پر ایمان لانے والے، اللہ سے شدید محبت رکھتے ہیں۔ (2:165) اس آیت میں محبت الٰہی سے کیا مراد ہے۔ صوفیا اس کو عشق الٰہی کے معنی میں لیتے ہیں۔ علما کا عام طور پر ماننا یہ ہے کہ محبت الٰہی سے مراد اطاعت الٰہی ہے۔ مگر ان دونوں تفسیروں میں محبت کا اصل مفہوم نہیں آتا۔ محبت دراصل کسی کے ساتھ نہایت گہرے قلبی میلان کا نام ہے، یعنی:

Strong affection, deep emotional attachment.

اللہ کے ساتھ یہ گہرا قلبی میلان اس انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے جو اللہ کے اعلیٰ انعامات کو شعوری طور پر دریافت کرے۔ اللہ نے انسان کو پیدا کیا جب کہ اس کا کوئی وجود نہ تھا (مریم، 9:19)۔ اللہ نے انسان کو بہترین صورت عطا فرمائی (غافر، 64)، اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6227)۔ انسان کو اللہ نے رہنے کے لیے زمین دی، جہاں استثنائی طور پر اس کی ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں، انسان کے لیے اللہ نے جنت کی صورت میں ایک معیاری دنیا (Perfect world) بنائی، جہاں اس کو پورا فل فلمینٹ حاصل ہو۔ اللہ نے انسان کو عقل دی جو حدیث کے مطابق، تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ اکرم و اشرف چیز ہے (ماخلق اللہ خلقاً اکرم علیہ من العقل) دیکھیے، نوادرالاصول للحکیم الترمذی، حدیث نمبر 1033۔ اللہ نے انسانوں کے اندر استثنائی طور پر مودت پیدا کی جس کی وجہ سے خاندان اور سماج جیسی چیز وجود میں آتی ہے (الروم، 21)۔ ان سب پر

مزید یہ کہ اللہ نے انسان کو استثنائی طور پر شعور دیا جس سے وہ انعامات الٰہی کو جانے۔ اللہ نے استثنائی طور پر انسان کو احساس لذات (Sense of Pleasure) دیا جس سے وہ انعامات سے پوری طرح محفوظ ہو سکے۔

اس طرح کے بے شمار انعامات ہیں جو اللہ نے انسان کو عطا کیے ہیں۔ جب آدمی ان بے شمار انعامات الٰہی کو سوچتا ہے تو اس کے اندر وہی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کو قرآن میں حب شدید (البقرہ، 165) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

قابل رشک افراد

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ البیہقی کے الفاظ یہ ہیں: الا اخبرکم عن اقوام لیسو بأنبیاء ولا تشهداء یغبطهم یوم القیامة الانبیاء والشهداء بمنازلهم من الله عزوجل علی منابر من نور یکونون علیها۔ قالوا من هم؟ قال: الذین یحبون عباد الله الی الله ویحبون الله الی عباده، وهم یمشون علی الارض نصحاء (شعب الایمان، حدیث نمبر 405)۔ یعنی کیا میں تم کو بتاؤں ایسے لوگوں کے بارے میں جو نہ پیغمبر ہوں گے اور نہ شہید، لیکن قیامت کے دن پیغمبر اور شہید ان پر رشک کریں گے، ان کے اس درجے کی وجہ سے جو اللہ کے یہاں ان کو حاصل ہو گا، وہ وہاں نور کے ممبروں پر ہوں گے۔ پوچھا گیا کہ وہ کون لوگ ہوں گے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو اللہ کے بندوں کو اللہ سے محبت کرنے والا بنائیں، اور ان کو اس قابل بنائیں کہ اللہ ان سے محبت کرے اور وہ زمین پر چلیں لوگوں کا ناصح (well wisher) بن کر۔

انبیاء کے لیے قابل رشک بننے والے یہ کون لوگ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کو اس طرح دریافت کریں کہ اللہ ان کا محبوب بن جائے۔ وہ اللہ کی محبت مین جینے لگیں۔ اللہ سے بڑی کوئی ذات نہیں، اس لیے اللہ کی محبت سے بڑا کوئی عمل نہیں ہو سکتا۔ جب کسی انسان کا یہ حال ہو گا تو وہ دوسروں کو بھی وہی اعلیٰ ترین چیز دینے کی کوشش کرے گا جو اس نے خود اپنے لیے پائی ہے۔ وہ اپنی ساری توانائی کو استعمال کر کے یہ کوشش کرے گا کہ دوسرے لوگ بھی خدا کو اس کی اس اعلیٰ حیثیت میں دریافت کریں جب کہ خدا کی معرفت ان کے دلوں میں اتر جائے، جب کہ خدا ان کے لیے وہ ہستی بن جائے جس سے وہ سب سے زیادہ محبت کرتے ہوں، جب کہ خدا کی ذات ان کے لیے وہ اعلیٰ ہستی بن جائے جو ان کے تمام قلبی جذبات کا مرکز ہو۔ جو لوگ اس طرح اللہ کو اپنا محبوب

بنالیں تو ایسے لوگ خود بھی اللہ کے محبوب بندے بن جاتے ہیں۔ یہی ایمان کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔

محبت ایک دوطرفہ معاملہ

ایک طویل روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ اس روایت کا ایک حصہ یہ ہے: قال رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم: واللہ لایلقی اللہ حبیبہ فی النار (مستدرک الحاکم حدیث نمبر 7347)۔ یعنی رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ خدا کی قسم، اللہ اس شخص کو آگ میں نہیں ڈالے گا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔

یہ حدیث کسی پراسرار معنی میں نہیں ہے۔ اس حدیث میں جس محبت کا ذکر ہے، وہ دوطرفہ ہے، نہ کہ یک طرفہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو انسان غور وفکر کے ذریعے اپنے خالق کو پہچانے، جو اللہ کو اپنے منعم کی حیثیت سے دریافت کرے، ایسے انسان کا حال یہ ہوگا کہ اللہ اس کا محبوب بن جائے گا، اس کے تمام قلبی جذبات اللہ سے وابستہ ہوجائیں گے۔

جب کسی انسان کا یہ حال ہو کہ اس کے شعوری ادراک کے نتیجے میں اللہ اس کا محبوب بن جائے تو اس کے بعد ایسا انسان خود بھی اللہ کا محبوب بن جاتا ہے۔ اور جب اِس اعتبار سے کوئی شخص اللہ کا محبوب بن جائے تو یہ محبوبیت اس آدمی کے لیے اس بات کی ضمانت ہوگی کہ اللہ اُس کو قیامت کے دن ہرگز آگ میں نہیں ڈالے گا۔

کسی انسان کا محبوب خدا بن جانا کوئی پراسرار چیز نہیں، یہ فطری اسباب کے تحت پیش آنے والا ایک واقعہ ہے۔ جب کوئی شخص اپنے آپ کو اللہ سے اتنا زیادہ وابستہ کرے کہ اللہ سے اُس کو محبت کے درجے میں تعلق پیدا ہوجائے، تو ایسا انسان، اللہ کی نظر میں اس کا مستحق بن جاتا ہے کہ اللہ اس کے ساتھ رحم کا معاملہ کرے اور اس کو آخرت کے عذاب سے بچالے۔

اللہ کا کسی انسان سے محبت کرنا بربنائے رحمت ہوتا ہے، اور انسان کا اللہ سے محبت کرنا بربنائے انعام ہوتا ہے۔ اللہ کی محبت کسی بندے کے لیے ایک عطیہ الٰہی ہے، اور بندے کی محبت اللہ کے لیے شکر واعتراف کا ایک معاملہ ہے۔ یہی شکر واعتراف بلاشبہ جنت کی قیمت ہے۔

خدا کی قربت

پلاسٹک سرجری (Plastic Surgery) کی ایک اصطلاح ہے۔ اس کو آٹو گریفٹنگ

(Auto Grafting) کہا جاتا ہے۔ کسی آدمی کے جسم کے کسی حصے میں اگر گریفٹنگ کرنا ہو تو اس کے اپنے جسم ہی کے حصے کی کوئی کھال (Skin) نکال کر اس مقام پر لگائی جاتی ہے۔ کسی دوسرے آدمی کے جسم کی کھال اس کام کے لیے کارآمد نہیں۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ولیم بائڈ (William Boyd) نے لکھا ہے: خودی غیر خودی کو قبول نہیں کرتی۔

Self will not accept not-self

آخرت میں سب سے زیادہ خوش نصیب وہ لوگ ہوں گے جن کو وہاں خدا کی ہم نشینی ملے جو خدا کے پڑوس (Neighbourhood) میں آباد کئے جائیں۔ یہ خوش قسمت انسان کون ہو گا؟ یہ وہ انسان ہو گا جو دنیا میں خدائی طرز زندگی اختیار کرے، جو خدا کی پسند کو اپنی پسند بنائے، جو خدا کے اخلاقی معیار پر پورا اترے۔ یہ اعلیٰ صفات صرف اُس انسان کے اندر پیدا ہو سکتی ہیں جو اپنے شعور کو اتنا زیادہ ترقی دے کہ وہ خدا کی معرفت کا اعلیٰ ادراک کر سکے۔ موت سے پہلے کی زندگی تیاری کے دور (Preparatory Period) کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ خدا کی پسند کو دریافت کرے اور پھر اپنی پوری شخصیت کی تعمیر اس خدائی پسند کے مطابق کرے۔ اس کا سوچنا، اس کا بولنا، اس کے سلوک اور آداب، اس کا پورا لائف اسٹائل (Life Style) خدا کے رنگ میں رنگ جائے۔ اس معاملے میں انسان اتنا زیادہ حساس ہو کہ وہ کسی بھی ملاوٹ کو قبول نہ کرے۔ یہی ربانی شخصیت ہے، اور جن لوگوں نے اپنے اندر اس قسم کی ربانی شخصیت کی تشکیل کی، وہی وہ خوش قسمت لوگ ہیں جو آخرت کی ابدی زندگی میں خداوند ذوالجلال کے پڑوس میں جگہ پائیں گے۔ جس طرح خودی غیر خودی کو قبول نہیں کرتی، اسی طرح خدا غیر خدائی انسان کو قبول نہیں کرے گا۔ آخرت کی ابدی دنیا میں صرف خدائی انسان ہوں گے جو خدا کے پڑوس میں جگہ پانے کی سعادت حاصل کریں گے۔

تسبیح خداوندی

قرآن میں بار بار یہ تعلیم دی گئی ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ کی تسبیح کرے۔ اس کے لیے دوسرے الفاظ بھی آئے ہیں۔ مثلاً تحمید، تمجید، تقدیس، وغیرہ۔ ان سب کا خلاصہ ایک ہے، اور وہ ہے اعتراف۔ انسان کی نسبت سے جس چیز کو اعتراف کہا جاتا ہے، اسی کو اللہ کی نسبت سے تسبیح و تحمید کہا گیا ہے۔ تسبیح و تحمید کے الفاظ دراصل اعتراف ہی کی منزہ تعبیریں ہیں۔ پھر ان سب کا خلاصہ صرف ایک ہے اور وہ گلوری فکیشن ہے، یعنی اللہ کی عظمت و کبریائی کا بندے کی زبان سے اظہار۔

خدا اور بندے کے درمیان جو نسبت ہے، وہ دینے والے اور پانے والے کی نسبت ہے۔ بندے کے پاس اللہ کو دینے کے لیے کچھ نہیں۔ واحد چیز جس کو ایک بندہ اپنے رب کے سامنے پیش کر سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اللہ رب العالمین کو اس کی حیثیت واقعی کے ساتھ دریافت کرے۔ اسی دریافت کا نام معرفت (Realization) ہے۔ جب کوئی بندہ جہاد فی اللہ کرتا ہے، یعنی اللہ کے معاملے میں انتہائی حد تک غور و فکر، اس وقت اللہ کی توفیق سے اس پر حقیقت خداوندی کا انکشاف ہوتا ہے۔ وہ کامل یقین کے درجے میں اللہ کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ اس کے بعد اپنے آپ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں ایک فکری بھونچال آجاتا ہے۔ وہ اندرونی طوفان کے ذریعے اللہ کا اعلیٰ اعتراف کرنے والے الفاظ بولنے لگتا ہے۔ یہ گویا معرفت داخلی کا خارجی الفاظ میں ڈھل جانا ہے۔ یہی وہ واقعہ ہے جس کو قرآن میں تسبیح و تحمید جیسے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ کسی انسان کا اس طرح اللہ کو دریافت کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ یہ مخلوق کا اپنے خالق کو دریافت کرنا ہے، یہ طالب کا اپنے مطلوب کو دریافت کرلینا ہے، یہ عاجز مطلق کا قادر مطلق کو دریافت کرلینا ہے۔ اس دریافت کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ وہ لمحہ ہے جب کہ ایک انسان اپنے رب کو اس کی حیثیت واقعی کے ساتھ دریافت کرلیتا ہے، وہ اس پوزیشن میں ہوجاتا ہے کہ وہ دیکھے بغیر اللہ کو دیکھے وہ دوری کے باوجود اللہ کی قربت کا تجربہ کرے۔

قادر مطلق، عاجز مطلق

خدا اور انسان کے درمیان جو نسبت ہے، وہ یہ نہیں ہے کہ خدا کُل ہے اور انسان اس کا جزء ہے، خدا سمندر ہے اور انسان اس کا ایک قطرہ ہے۔ اس قسم کی تمام نسبتیں سر تا سر بے بنیاد ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان ''ہے'' اور ''نہیں'' کی نسبت ہے۔ خدا سب کچھ ہے اور انسان اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ خدا، واجب الوجود (Self-existing) ہے، اور انسان مکمل طور پر اور ہر اعتبار سے خدا کے حکم سے وجود میں آنے والی صرف ایک مخلوق۔

انسان کی صفت یہ ہے کہ وہ ایک صاحب شعور مخلوق ہے۔ انسان کے ذریعے اس کائنات میں شعوری عجز کا واقعہ وجود میں آتا ہے، اور بلاشبہ اس سے بڑا کوئی دوسرا واقعہ نہیں۔ یہی انسان کی اصل قیمت ہے۔ انسان وہ نادر مخلوق ہے، جو اس کائنات میں شعور قدرت کے مقابلے میں شعور عجز کی دوسری انتہا (Extent) بناتا ہے، وہ کائنات کے صفحے پر ''عدد'' کے مقابلے میں ''صفر'' کا ہندسہ

تحریر کرتا ہے، وہ خداوندی انا کے مقابلے میں اپنے بے انا ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

یہی شعور عجز انسان کا سب سے بڑا سرمایہ (Asset) ہے۔ یہی کسی انسان کے لیے اس کی سب سے بڑی دریافت (Discovery) ہے۔ جب کوئی عورت یا مرد، عجز کی زبان بولیں تو انہوں نے اپنی زبان کا صحیح استعمال کیا۔ اس کے مقابلے میں جو عورت یا مرد فخر اور سرکشی اور خود نمائی اور گھمنڈ اور اظہار برتری کی زبان بولیں، تو انہوں نے اپنی زبان کا غلط استعمال کیا۔ اس دنیا میں صرف اس انسان کو جینے کا حق ہے، جو اس کی قیمت ادا کرے، اور یہ قیمت عجز ہے۔ عجز کی قیمت ادا کیے بغیر اس دنیا میں رہنا بلاشبہ ایک جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

عجز دراصل حقیقت شناسی کی اعلیٰ ترین صورت کا نام ہے۔ عجز کوئی مجبورانہ چیز نہیں عجز دراصل وہ مثبت کیفیت ہے، جو حقیقت اعلیٰ کے اختیارانہ اعتراف سے پیدا ہوتی ہے، عجز کوئی انفعالی کیفیت نہیں، وہ تمام فعال کیفیات سے زیادہ بڑی فعال کیفیت ہے۔

شکر و اعتراف

سب سے بڑی چیز جو انسان سے مطلوب ہے وہ یہ کہ وہ اپنے خالق و مالک کا شاکر بنے، وہ اللہ کی نعمتوں پر اللہ کا اعتراف کرے۔ مگر دنیا میں سب سے کم جو چیز پائی جاتی ہے، وہ یہی شکر یا اعتراف ہے۔ انسان خدائی انعامات کے ہجوم میں زندگی گزارتا ہے، لیکن وہ ناشکرا بنا رہتا ہے۔

اس کا سبب کیا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ انسان ہر ملی ہوئی چیز کو خدا کے بجائے خود اپنے خانہ میں ڈال لیتا ہے۔ اس کو وجود کس طرح ملا، ماں باپ کے ذریعے۔ وہ دنیا میں زندہ کیسے ہے، اپنی تدبیروں کے ذریعہ۔ اس نے ترقی کس طرح کی، اپنی ہوشیاری کے ذریعہ۔ اس کے معاملات درست کیسے ہوئے، اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے ذریعے۔ اس نے عزت کا مقام کس طرح پایا، اپنے تعلقات کے ذریعہ وغیرہ۔

اس طرح یہ ہوتا ہے کہ جن ملی ہوئی چیزوں کو انسان نے خدا سے پایا ہے ان کو خدا سے منسوب (Associate) کرنے کے بجائے، وہ ان کو کسی اور سے منسوب کر دیتا ہے۔ منسوب کرنے کی ہی غلطی کا یہ نتیجہ ہے کہ انسان کے اندر خدا کے لیے شکر و اعتراف کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا۔ خدا کے لیے شکر و اعتراف یہ نہیں ہے کہ آپ مختلف مواقع پر الحمدللہ اور سبحان اللہ کے الفاظ بول دیں۔

شکر ہمیشہ ایک دریافت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آدمی پہلے خدا کے محسن ہونے کی حقیقت کو دریافت

کرتا ہے۔ یہ دریافت اس کے ذہن کو بیدار کرتی ہے۔ اس کے بعد ذہن کے اندر ایک پراسس جاری ہوتا ہے، پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے سینے میں اللہ کے لیے شکر کا چشمہ جاری ہو جاتا ہے۔

آدمی کے اندر پیدا ہونے والی یہ داخلی کیفیت شکر واعتراف کے الفاظ میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ دریافت کی سطح پر جس نے شکر کو نہیں جانا، وہ اظہار کی سطح پر بھی شکر کی مطلوب عبادت نہیں کر سکتا۔

محاسبہ کے بغیر

بہت سے لوگ ہیں جو خدا کے وجود کو مانتے ہیں، لیکن وہ آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔ اس قسم کا عقیدۂ خدا بلاشبہ ایک غیر مطلوب عقیدہ ہے۔ خدا کے بارے میں درست عقیدہ صرف وہ ہے جس میں آدمی مواخذہ (Accountability) کے تصور کو مانتا ہو، یعنی موت کے بعد خدا کے سامنے حاضری اور اپنے تمام اعمال کی جواب دہی۔ محاسبہ اور مواخذہ کے تصور کے بغیر خدا کو ماننا، خدا کا مطلوب عقیدہ نہیں۔

خدا کے وجود کے بارے میں غیر مسلم حضرات نے ایسی کتابیں چھاپی ہیں جو مسلم مصنفین سے بہت زیادہ بہتر ہیں، مگر ان کتابوں میں محاسبہ آخرت حذف ہے، البتہ خدا کے عقیدے کو پر زور طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً درج ذیل دو کتابیں:

1. Man Does not Stand Alone by Dr. Cressy Morrison
2. Evidence of God in an Expanding Universe, Compiled by John Clover Monsma

موخر الذکر کتاب کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ مثلاً اللہ یتجلی فی عصر العلم (عربی)۔

حقیقت یہ ہے کہ محاسبہ آخرت کے تصور کے بغیر خدا کو ماننا یا اس پر لکھنا اور بولنا ایک قسم کی روحانی شاعری (Spiritual song) ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ خدا پر درست عقیدہ وہ ہے جس میں آدمی خدا کو خالق اور رب ماننے کے ساتھ اس کو محاسب بھی مانتا ہو، یعنی ایسا خدا جو اس کا مواخذہ کرے اور جو سزا اور جزا کا اختیار رکھتا ہو۔ خدا کا درست عقیدہ وہ ہے، جس میں خدا کے تصور سے آدمی کا دل دہل اٹھے (الانفال، 2) اور اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں (الزمر، 23)۔ خدا کا درست عقیدہ وہ ہے جو آدمی کے دماغ میں طوفان بن کر داخل ہو، جو آدمی کے دل کو مستقل تڑپ میں مبتلا کر دے۔ نام کے عشق الٰہی اور جلوہ الٰہی کا تصور اس قسم کی مطلوب کیفیت پیدا نہیں کر سکتا۔

جذبات پرستش

انسان اپنے پیدائشی مزاج کے اعتبار سے ایک پرستش پسند مخلوق ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ کوئی اس کا معبود ہو جس کی وہ پرستش کرے۔ کوئی ہو جس کو وہ اپنی توجہات کا مرکز بنا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام قومیں ہیرو پرست ہوتی ہیں۔ وہ اپنے "اکابر" کو اپنے خدا پرستانہ جذبات کا مرکز بنا لیتی ہیں۔ ہیروؤں سے غیر معمولی لگاؤ در حقیقت اس جذبہ عبودیت کا غلط استعمال ہے جو اللہ نے ہر آدمی کے اندر پیدائشی طور پر رکھ دیا ہے۔ جس طرح ہر آدمی کو پیاس لگتی ہے اور وہ پانی پینے پر مجبور ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر آدمی خود اپنے اندرونی جذبے کے تحت مجبور ہے کہ وہ کسی کو معبود بنا کر اس کی پرستش کرے۔ کوئی بھی شخص اس احساس سے خالی نہیں ہو سکتا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ جو لوگ اپنے جذبات پرستش کا مرکز ایک خدا کو بنائیں وہ سچے پرستار ہیں، وہ امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ جو لوگ اپنے جذباتِ پرستش کا مرکز کسی غیر خدا کو بنا لیں وہ جھوٹے پرستار ہیں، وہ امتحان میں ناکام ہو گئے۔

کچھ لوگ ہیں جو اپنی فطرت میں چھپے ہوئے جذباتِ پرستش کا مرکز بتوں کو یا مظاہر فطرت کو بناتے ہیں۔ کچھ اور لوگ ہیں جو اپنے قومی ہیروؤں کو اپنا معبود بنا لیتے ہیں اور اپنے جذباتِ پرستش ان کے لیے خاص کر دیتے ہیں۔ یہ سب شرک ہے اور شرک کو خدا کبھی قبول نہیں کرے گا۔

اسی طرح ایک اور طبقہ ہے جو اپنے "اکابر" سے وہ محبت کرنے لگتا ہے جو خدا سے ہونی چاہیے۔ اپنے اکابر کی باتوں کو وہ اہمیت دینے لگتا ہے جو خدا کی باتوں کو دینا چاہیے۔ جو اپنے اکابر پر کسی بھی قسم کی تنقید سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اکابر کی تقدیس و تعظیم ہی اس کا سرمایہ حیات ہوتی ہے۔ یہ بھی بلاشبہ وہی چیز ہے جس کو قرآن میں غیر اللہ کو اپنا معبود بنانا کہا گیا ہے (التوبہ، 31)

حقیقی موحد وہ ہے جس کے جذبات کا مرکز آخری حد تک صرف خدا بن جائے، جو انسانی شخصیتوں میں اٹکا ہوا نہ ہو، ایسا آدمی اکابر کے خلاف تنقید سن کر کبھی نہیں بھڑکے گا۔

خدا کا پڑوس

جنت کیا ہے، جنت دراصل خدا کے پڑوس میں رہنے کا نام ہے (التحریم، 11)۔ موت سے پہلے کی دنیا میں مومن احساس کے اعتبار سے، خدا کے پڑوس میں جیتا ہے۔ موت کے بعد کی دنیا میں

مومن واقعہ کے طور پر خدا کے پڑوس میں زندگی گزارے گا۔

خدا بلاشبہ تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس لیے کسی انسان کو حقیقی سکون صرف خدا کے پڑوس میں مل سکتا ہے، اس سے کم تر درجے کی کوئی چیز انسان کے لیے حقیقی سکون کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

موجودہ دنیا دراصل اسی قسم کے انسانوں کا انتخابی مقام (Selection Ground) ہے۔ یہاں ان انسانوں کو چنا جارہا ہے جو اپنی صفات کے اعتبار سے، خدا کے پڑوس میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔ جن کی سوچ، جن کی سرگرمیاں، جن کے جذبات، جن کا سلوک، جن کے معاملات اس اعلیٰ اخلاقی معیار پر پورے اتریں، جو خدا کا پڑوسی بننے کے لیے مطلوب ہیں۔ یہی لوگ اس عزت کے لیے منتخب کئے جائیں گے۔ یہ انتخاب فرشتوں کے ریکارڈ کی بنیاد پر کیا جائے گا۔

آخرت کی ابدی زندگی میں کسی کو خدا کے پڑوس میں رہنے کی یہ خوش قسمتی تمام تر ذاتی خصوصیت (Merit) کی بنیاد پر حاصل ہوگی۔ خدا کا پڑوس گویا کہ ایک کائناتی باغ ہے۔ اس کائناتی باغ میں صرف خدائی معیار پر پورا اترنے والے لوگ ہی جگہ پائیں گے۔ خدائی معیار سے کم تر کوئی چیز کسی آدمی کو اس کائناتی باغ میں جگہ دینے والی نہیں۔

یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے دنیا کی زندگی میں صرف خدا کو اپنا واحد کنسرن (Superme concern) بنایا ہوا جن کی سوچ اور جن کے جذبات تمام تر خدا کے لیے وقف ہوگئے ہوں، جن کی صبح بھی خدا کی یاد سے معمور ہو اور جن کی شام بھی خدا کی یاد سے معمور۔ یہی وہ خوش قسمت لوگ ہیں جو خدا کے پڑوس میں رہنے کے لیے منتخب کئے جائیں گے۔

جنت کی تلاش

ہر آدمی کے ذہن میں ایک خوب صورت دنیا بسی ہوئی ہے، ایک ایسی دنیا جو کامل ہو، جو معیاری ہو، جہاں اس کی تمام آرزوئیں پوری ہوسکیں۔ یہی ذہنی تصور ہر آدمی کے لیے اس کے عمل کا سب سے بڑا محرک ہے۔ ہر عورت اور مرد اس کو حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی پوری زندگی اور اپنی ساری طاقت اس کے راستے میں لگا دیتے ہیں، لیکن آخر میں یہ ہوتا ہے کہ ہر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنی مطلوب دنیا کو نہ پاسکا۔ ہر آدمی اپنی زندگی اعلیٰ حوصلے کے ساتھ شروع کرتا ہے لیکن ہر آدمی اس احساس کے ساتھ مرجاتا ہے کہ وہ ساری کوشش کے باوجود اپنی مطلوب دنیا کو پانے میں ناکام رہا۔

یہی پوری انسانیت کی تاریخ ہے۔ اس میں کسی عورت یا کسی مرد کا کوئی استثنا نہیں۔ یہ انسانیت کا سب سے بڑا سوال ہے۔ کیوں ایسا ہے کہ لوگ امیدوں اور حوصلوں کے ساتھ اپنی زندگی کا آغاز کرتے ہیں، لیکن وہ محرومی کے احساسات کو لے کر مر جاتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں جو خوب صورت دنیا بسی ہوئی ہے، وہ خدا کے تخلیقی پلان کے مطابق، جنت کی دنیا ہے اور جنت کسی کو موت کے بعد آنے والے مرحلہ حیات میں ملے گی، نہ کہ موت سے پہلے والے مرحلہ حیات میں۔ انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی مطلوب جنت کو موجودہ دنیا ہی میں پالے، مگر جنت کا حصول موجودہ دنیا میں ممکن نہیں۔

اس معاملے میں انسان اور جنت کی مثال مچھلی اور پانی جیسی ہے۔ مچھلی کو سکون صرف پانی کے اندر ملتا ہے، پانی کے باہر نہیں۔ اسی طرح انسان کو صرف جنت میں سکون ملے گا۔ جنت کے باہر اس کو سکون، یا فل فل مینٹ (Fulfilment) ملنے والا نہیں۔

جنت کی تلاش دراصل مستقبل کی تلاش کا دوسرا نام ہے، اور مستقبل صرف مستقبل میں ملتا ہے اور کسی کو حال میں ملنے والا نہیں۔ انسان کو اگر اس حقیقت کی دریافت ہو جائے تو وہ موجودہ دنیا کو مطلوب جنت کی تیاری کی جگہ سمجھے گا، نہ کہ خود مطلوب جنت کو پانے کی جگہ۔

طالب جنت بنئے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا ہے (التین، 4)۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ انسان استثنائی طور پر ایک ایسی مخلوق ہے جو احساس لذت (Sense of Pleasure) رکھتا ہے۔ وسیع کائنات میں بہت سی مخلوقات ہیں۔ مثلاً ستارہ، سیارہ، سورج، چاند، سمندر، درخت، حیوانات وغیرہ لیکن ان میں سے کسی کو بھی احساس لذت کی نعمت حاصل نہیں۔ ایک طرف، اللہ نے انسان کو اعلیٰ درجے میں لذت کا احساس رکھنے والی مخلوق کے طور پر بنایا ہے۔ اور دوسری طرف، اس نے ایک انوکھی دنیا بنائی جس کا نام جنت ہے۔

جنت وہ مقام ہے جہاں وہ تمام سامان لذت کمال درجے میں موجود ہے جس کا احساس لے کر انسان پیدا ہوتا ہے، لیکن وہ اس دنیا میں سامان لذت کو نہیں پاتا جو اُس کے لیے فل فل مینٹ (Fulfilment) کا ذریعہ بن سکے۔

یہی موجودہ دنیا میں انسان کا معاملہ ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان کو طالب جنت بن کر رہنا ہے۔ جو شخص موجودہ دنیا میں اس طرح رہے کہ وہ حقیقی معنوں میں طالب جنت بن گیا ہو، وہی خدا کا مطلوب انسان ہے اور اسی کو ابدی جنت میں آباد کرنے کے لئے منتخب کیا جائے گا۔

جو لوگ اپنی موجودہ زندگی میں جنت کے طالب نہ بن سکیں، جن کا دل جنت کے سوا کسی اور چیز میں لگا ہوا ہو، وہ اللہ کے مطلوب انسان نہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی نعمتوں کی قدر نہیں کی، ان کا کیس ناقدری کا کیس ہے، نہ کہ قدر دانی کا کیس۔

ایسے لوگ جنت کے باغوں میں بسنے کے لیے نااہل قرار پائیں گے۔ جنت کے ابدی دستر خوان پر بیٹھنے کی سعادت انہیں حاصل نہ ہو گی۔ انہوں نے موجودہ دنیا میں خدا کی جنت سے نگاہیں پھیر لی تھیں، آخرت میں خدا ان سے اپنی نگاہیں پھیر لے گا۔ آخرت کی دنیا میں ان کو ابدی محرومی کے سوا کچھ اور ملنے والا نہیں۔

جنت کی قیمت

جنت خدا کی بنائی ہوئی ایک انوکھی دنیا ہے۔ جنت میں اعلیٰ معیار کی حد تک ہر قسم کی راحت اور خوشی موجود ہے۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان کو ہر قسم کا تکملہ (Fulfilment) ہمیشہ کے لیے حاصل ہو گا (فصلت، 31)۔ جنت کی یہ انوکھی دنیا کس کو ملے گی، جنت کی یہ دنیا موت کے بعد کی ابدی زندگی میں اس عورت یا مرد کو ملے گی جو اس کی قیمت ادا کرے۔ جنت اس کے لیے ہے جو حقیقی معنوں میں ربانی انسان یا خدا والا انسان بن جائے، جو بظاہر خدا سے دور ہوتے ہوئے معرفت کی سطح پر خدا سے قریب ہو جائے۔ جنت خدا کے پڑوس کا نام ہے۔ آخرت کی دنیا میں خدا کا پڑوس صرف اس شخص کو ملے گا جو آخرت سے پہلے کی دنیا میں خدا کے پڑوس میں جینے لگے۔

انسان اپنے آپ کو ایک پیدا کئے جانے والی مخلوق کی صورت میں دیکھتا ہے۔ اس کے برعکس، اُسے خدا کو لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ (الاخلاص: 3) کی صورت میں ڈسکور کرنا ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان دیکھ کر چیزوں کے اوپر یقین کرتا ہے، خدا کے اوپر اس کو دیکھے بغیر یقین کرنا ہے۔ انسان مال اور اولاد جیسی چیزوں سے بے پناہ محبت کرتا ہے، اس کو خدا کے ساتھ ایسا تعلق قائم کرنا ہے، جب کہ وہ سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے لگے اور سب سے زیادہ خدا سے محبت کرنے لگے۔

انسان آج کی چیزوں میں جیتا ہے اور وہ آج کی چیزوں کو اہمیت دیتا ہے، جنت اس انسان کے لیے ہے جو آج کی چیزوں سے اوپر اٹھ جائے اور صرف ایک خدا کو اپنا سپریم کنسرن بنا لے۔ انسان کا یہ حال ہے کہ وہ بھرپور دل چسپی کا تعلق اپنے لوگوں سے رکھتا ہے، اور خدا کے ساتھ اس کا تعلق صرف رسمی اور ظاہری سطح پر ہوتا ہے، ایسے لوگوں کو جنت میں داخلہ ملنے والا نہیں۔ جنت میں داخلہ صرف وہ لوگ پائیں گے جن کا حال یہ ہو جائے کہ خدا کے سوا دوسری تمام چیزوں سے ان کا تعلق صرف دنیوی ضرورت کے طور پر ہو، اور دل چسپی اور قلبی لگاؤ کے اعتبار سے ان کا تعلق تمام تر خدا سے ہو جائے۔

جنت میں داخلے کی شرط

آدم پہلے انسان تھے اور پہلے پیغمبر بھی۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کر کے ان کو اور ان کی بیوی حوا کو جنت میں رکھا، اور کہا کہ تم دونوں یہاں رہو اور آزادانہ طور پر یہاں کے سامان راحت سے فائدہ اٹھاؤ۔ لیکن تم اس شجر ممنوعہ کے قریب نہ جانا، ورنہ تم ظالم ہو جاؤ گے (البقرہ،35) مگر شیطان کے وسوسے سے متاثر ہو کر انہوں نے ممنوعہ درخت کا پھل کھا لیا۔ اس کے بعد آدم اور حوا دونوں جنت سے نکال کر موجودہ زمین میں ڈال دیے گئے، اور آدم سے اور ان کی پوری نسل سے یہ کہہ دیا گیا کہ جو عمل کا ثبوت دے گا، وہی ابدی جنت میں جگہ پائے گا۔ زندگی کے آغاز کی یہ مثال بتاتی ہے کہ جنت کے حصول کی شرط کیا ہے۔ جنت کسی کو پراسرار طور پر نہیں ملے گی، اور نہ کسی کی سفارش کسی کو جنت کا مستحق بنائے گی۔ جنت کسی کو پیدائشی حق کے طور پر ملنے والی نہیں، یہاں تک کہ پیغمبر کو بھی نہیں:

Paradise in not a birth right, even for the Prophets.

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کے ذریعے سارے انسانوں کے لیے یہ مثال قائم کر دی اور بتا دیا کہ جنت کسی خود ساختہ عقیدے کے تحت کسی کو ملنے والی نہیں۔ یہ اصول اتنا عام ہے کہ اس میں پیغمبروں تک کا کوئی استثنا نہیں ہے۔

حضرت آدم کے واقعے میں ایک اور بے حد اہم بات معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ جنت کے حصول کا مدار سب سے پہلے جس چیز پر ہے، وہ ہے اپنی خواہشوں پر کنٹرول اور اپنی عقل کو اتنا زیادہ ترقی دینا کہ وہ شیطان کے وسوسوں سے بچ سکے۔ انسان کے اندر ابدی کامیابی کی خواہش بے پناہ طور پر موجود

ہے۔ اسی خواہش کے راستے سے شیطان نے آدم کے اوپر حملہ کیا اور وہ کامیاب ہو گیا۔ اسی طرح انسان کے اندر بہت سی خواہشیں ہیں۔ ہر خواہش انسان کے اندر شیطان کے داخلے کا دروازہ ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی خواہش کے ہر دروازے پر چوکیدار بنا رہے، تاکہ شیطان اس کے اندر داخل ہو کر اس کو خدا کی رحمت سے دور نہ کرسکے۔

جنت ایک نظریہ حیات

جنت کا عقیدہ سادہ طور پر صرف ایک عقیدہ نہیں ہے، وہ پورے معنوں میں ایک نظریہ حیات ہے۔ جنت کے عقیدہ کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے۔ جنت کی اہمیت کو صرف اس وقت سمجھا جاسکتا ہے، جب کہ اس کو انسان کی پوری زندگی سے جوڑ کر دیکھا جائے۔

انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ ایک متلاشی، جنت حیوان (Paradise- seeking animal) ہے۔ انسان کی پوری فطرت ایک ایسی دنیا چاہتی ہے جو اس کے لیے آئڈیل دنیا (Ideal world) ہو، جہاں اس کو تمام چیزیں معیاری درجے میں حاصل ہوں، اسی کا نام جنت ہے اور اس جنت کا حصول ہر عورت اور ہر مرد کا مشترک خواب ہے۔

انسان کی موجودہ حالت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام انسان آخری حد تک مادی چیزوں کے حریص بنے ہوئے ہیں۔ ہر آدمی زیادہ سے زیادہ دولت اور زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ سب اسی لیے ہے کہ انسان یہ چاہتا ہے کہ اپنی فطرت میں چھپی ہوئی جنت کو وہ اس دنیا میں واقعہ بنا سکے۔ مگر یہاں ایک حقیقت اس کے لیے مستقل رکاوٹ ہے۔ موجودہ دنیا اپنے اسباب کے اعتبار سے ایک غیر معیاری دنیا (Imperfect world) ہے۔ اس قسم کی غیر معیاری دنیا میں، معیاری جنت کی تعمیر سرے سے ممکن ہی نہیں۔

امکان اور واقعہ کے درمیان یہی تضاد اس دنیا کی تمام برائیوں کا اصل سبب ہے۔ اسی بنا پر لوگ مستقل طور پر ذہنی تناؤ (Tension) میں جیتے ہیں، اسی بنا پر لوگ تشدد پسند بن جاتے ہیں، اسی بنا پر لوگ جھنجھلاہٹ (Frustration) کا شکار رہتے ہیں۔

اس مسئلے کا حل صرف ایک ہے، وہ یہ لوگوں کے اندر اس حقیقت کا شعور پیدا کیا جائے کہ جنت کسی کو صرف اگلی دنیا میں مل سکتی ہے، نہ کہ موجودہ دنیا میں۔ جنت کا عقیدہ آدمی کو حقیقت پسند بناتا ہے اور حقیقت پسندی ہی تمام کامیابیوں کا واحد راز ہے۔

جنت کی قیمت

ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے اور جنت کی قیمت خدا کی معرفت ہے۔ معرفت خداوندی سے کم تر درجے کی کوئی چیز جنت کی قیمت نہیں بن سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ جنت کی تصغیر ہے کہ معرفت اعلیٰ سے کم تر کسی چیز کو جنت کی قیمت سمجھا جائے۔

معرفت کیا ہے، معرفت (Realization) دراصل خدا کی دریافت (Discovery) کا نام ہے۔ یہ نہ دکھائی دینے والے خدا کو بصیرت کی آنکھ سے دیکھ لینا ہے۔ یہ اعلیٰ شعور کا ایک ایسا درجہ ہے جب کہ آدمی کے لیے خدا کے سوا ہر چیز غیر اہم بن جائے، جب کہ خدا کے سوا ہر چیز اپنی کشش کھو دے، جب کہ خدا ہی انسان کا سب سے بڑا کنسرن (Concern) بن جائے۔

یہ معرفت کوئی سادہ بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معرفت کے اوپر شبہادت (Doubts) کے ہزاروں پردے پڑے ہوئے ہیں۔ جو آدمی شبہات کے ان پردوں کو پھاڑ سکے وہی اس اعلیٰ یقین کے درجے تک پہنچتا ہے جس کو معرفت کہا جاتا ہے۔ معرفت کے متلاشی کو بہر حال اس امتحان میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ جو آدمی شبہات کے پردے کو پھاڑنے کے اس امتحان میں پورا اترے وہی معرفت خداوندی کا تجربہ کر سکتا ہے۔

حصول معرفت کی حقیقی پہچان صرف ایک ہے، اور وہ داخلی ہے۔ یعنی یہ کہ آدمی خدا کو اس طرح پائے کہ وہ کامل طور پر اس کی فطرت کی آواز بن جائے۔ آدمی پیدائشی طور پر ایک متلاشی انسان ہے۔ آدمی پیدائشی طور پر حقیقت اعلیٰ کو دریافت کرنا چاہتا ہے۔ معرفت اسی تلاش کا جواب ہے۔ ایک بچہ اپنی ماں کی تلاش میں ہو تو اپنی ماں کو پا کر وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اس سے لپٹ جاتا ہے۔ یہی معاملہ صاحب معرفت کا ہے۔ جب کسی انسان کو حقیقی معنوں میں خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے تو اہ اس کو پانے کے بعد اس طرح کامل طور پر اپنے خدا کے ساتھ جڑ جاتا ہے جس طرح ایک چھوٹا بچہ اپنی ماں کے ساتھ۔ معرفت کے معاملے میں کوئی بھی عذر (Excuse) قابل قبول نہیں۔ جو آدمی موجودہ دنیا میں معرفت کے حصول میں اندھا ثابت ہو وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ معرفت جب اپنے دلائل اور اپنی نشانیوں کے ساتھ سامنے آتی ہے تو کسی بینا انسان کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو نہ پہچانے۔ اس کے وجود میں چھپا ہوا احساس معرفت کافی ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو پہچاننے سے محروم نہ رکھے۔

ایک بچے کی ماں غائب ہو اور پھر وہ اس کے سامنے آجائے تو یہ ناممکن ہوتا ہے کہ بچہ اپنی ماں کو پہچاننے میں ناکام رہ جائے۔ بچے کے اندر ماں کی معرفت اتنی زیادہ قوی ہوتی ہے کہ اس کے لیے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ اس کی ماں اس کے سامنے آجائے اور وہ اس کو پہچاننے سے قاصر رہے۔ اسی طرح جب دلائل اور نشانیوں کے ذریعے خدا کی معرفت کسی آدمی کے سامنے کھل جائے تو وہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کو نہ پہچانے۔ جو بچہ اپنی ماں کو نہ پہچانے وہ بلاشبہ اندھا ہے وہ اپنی باہر کی آنکھ سے بھی محروم ہے اور اپنی اندر کی آنکھ سے بھی محروم۔

جنت ابدی راحتوں کی دنیا ہے۔ وہ کون لوگ ہیں جو موت کے بعد اس قابل ٹھیریں گے کہ وہ جنت کی معیاری دنیا میں جگہ پائیں۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے موت سے پہلے کی زندگی میں فکری اور عملی اعتبار سے، اپنے آپ کو جنت جیسی معیاری دنیا میں رہنے کا مستحق بنایا ہو گا۔

یہ جنت کا کم تر اندازہ ہے کہ کسی اور چیز کو جنت کی قیمت سمجھ لیا جائے۔ مثلاً یہ ماننا کہ کسی بزرگ کا دامن تھامنے سے جنت مل جائے گی، اسی طرح کسی گروہ سے وابستہ ہونا، کچھ رسمی اعمال کر لینا، کسی مقدس مقام کی زیارت کر لینا، دین کے نام سے کسی دھوم کا مظاہرہ کرنا، حمد اور نعت کے لفظی ترانے اسٹیج پر گانا، اوراد اور وظائف میں مشغول رہنا، دین کے نام پر دکھاوے کی شان دار بلڈنگ بنانا، جلسے اور جلوس کے ہنگامے کھڑے کرنا، اسلام کو اپنے لیے فخر کی چیز بنا لینا وغیرہ۔ اس قسم کی کسی چیز کا کوئی تعلق جنت سے نہیں، اس قسم کی کوئی بھی چیز آدمی کو ہرگز جنت میں لے جانے والی نہیں۔

جنت میں صرف وہ لوگ داخل کیے جائیں گے جن کو قرآن میں تزکیہ یافتہ شخصیت (Purified Personality) کہا گیا ہے (طٰہٰ، 76)۔ جنتی شخصیت وہ ہے جو جنت کے تقاضوں کی نسبت سے ایک تیار شدہ شخصیت (Perpared Personality) ہو۔ شخصیت کی یہ تیاری اسی موجودہ دنیا میں ہوتی ہے۔ موجودہ دنیا میں مختلف قسم کے حالات اور تجربات کے دوران آدمی اپنے آپ کو پاکیزہ شخصیت بناتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو منفی جذبات سے بچا کر مثبت مزاج پر قائم رکھتا ہے۔ ناموافق حالات کے باوجود وہ اصول پسند بنا رہتا ہے، وہ انصاف کی روش سے کبھی نہیں ہٹتا۔ وہ اپنی خواہشوں پر کنٹرول کرتا ہے، وہ اپنے آپ کو آزادی کے غلط استعمال سے بچاتا ہے۔ وہ کسی دباؤ کے بغیر دوسروں کا حق ادا کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ وہ دوسروں کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کو پورا کرتا ہے۔ نہ کوئی ناکامی اس کو مایوس کرتی ہے اور نہ کوئی کامیابی اس کو سرکش بناتی ہے۔ یہی جنتی شخصیت ہے، اور ایسے ہی لوگ جنت کے باغوں میں جگہ پائیں گے۔

سفارش نہیں، استحقاق

بعد کے زمانے میں مسلمانوں میں بہت سی ایسی موضوع روایتیں رائج ہوئیں جو یہ بتاتی تھیں کہ جنت میں داخلے کا معاملہ سفارش (Recommendation) پر مبنی ہے، نہ کہ استحقاق (Merit) پر۔ مثلاً یہ کہ جس گھر میں ایک حافظ ہو، اس کی سفارش پر اس کے خاندان کے بہت سے لوگ جنت میں داخل کر دیے جائیں گے۔ اسی طرح پیغمبر کے بارے میں بہت سی موضوع روایتیں رائج ہوئیں۔ مثلاً الصالح للہ والطالح لی "نیک خدا کے لیے ہے، اور بد میرے لیے" (یعنی میں اس کی سفارش کروں گا) وغیرہ۔ مگر یہ تمام روایتیں قطعی طور پر بے بنیاد ہیں، اسلام میں ان کی کوئی اصل نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا مستحقینِ جنت کے انتخاب (Selection) کی دنیا ہے۔ جنت میں صرف انہی لوگوں کو داخلہ ملے گا جنھوں نے موجودہ دنیا میں اپنے عمل سے اس کا استحقاق ثابت کیا ہو۔ قرآن کی سورہ النجم میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں انسان کے لیے وہی ہے جس کے لیے اس نے دنیا کی زندگی میں کوشش کی (النجم، 39)۔ اسی طرح قرآن کی سورہ البقرہ میں بتایا گیا ہے کہ آخرت کے دن کسی آدمی کے لیے نہ خرید و فروخت کام آئے گی اور نہ دوستی اور نہ سفارش (البقرہ، 254)۔

سفارشی جیسی چیزوں کو جنت میں داخلے کا ذریعہ سمجھنا، جنت کی تصغیر اور توہین (Underestimation) ہے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں تمام انسانوں کی زندگی کا اعمال نامہ (Record) تیار کیا جا رہا ہے۔ جنت ایک اعلیٰ ترین مقام ہے، اور موجودہ دنیا کے ریکارڈ کی بنیاد پر اعلیٰ ترین انسانوں کو وہاں آباد کرنے کے لیے منتخب کیا جائے گا۔ قرآن کے مطابق، جنت وہ جگہ ہے جو خدائے برتر کے پڑوس میں بنے گی، اور جہاں سچے لوگ سچائی کی دنیا میں ابدی جگہ پائیں گے (القمر، 55) جنت خدا کے پڑوس (التحریم، 11) میں رہنے کا نام ہے۔ یہ تصور مضحکہ خیز حد تک بے اصل ہے کہ خدائے برتر کے پڑوس میں داخلہ کسی کو محض انسانی سفارش کی بنیاد پر حاصل ہو جائے۔

جنت کا مستحق کون؟

جنت خوشیوں اور راحتوں کی ایک ناقابل قیاس دنیا ہے۔ جنت صرف ان لوگوں کو ملے گی جو ناقابل قیاس کردار کی قیمت دے کر، اس کا استحقاق ثابت کر دیں۔ جنت، ابدی خدا کے پڑوس میں ابدی سیٹ حاصل کرنے کا نام ہے (القمر، 55)۔ اس قسم کی غیر معمولی اقامت گاہ صرف انہیں خوش

قسمت لوگوں کو مل سکتی ہے جو اس کی اعلیٰ قیمت دینے کا حوصلہ کر سکیں۔

جنت کی ناقابل قیاس سیٹ کو پانے کے لیے انسان کو ناقابل قیاس عمل کا ثبوت دینا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ناقابل مشاہدہ (Unobservable) کو قابل مشاہدہ (Observable) بنا سکے۔ وہ زمان و مکان (Time and Space) کے اندر رہتے ہوئے، زمان و مکان کے باہر دیکھنے والی نگاہ پیدا کرے۔ وہ الفاظ کے تاریک جنگل میں معانی کی روشنی کو پا سکے۔ وہ خواہشوں کے سمندر میں رہتے ہوئے، اپنے آپ کو اس سمندر میں ڈوبنے سے بچائے۔ وہ انانیت (Egoism) کا پہاڑ ہوتے ہوئے، اپنے آپ کو بے انا (Egoless) بنا سکے۔ وہ بدخواہ لوگوں کو بھیڑ میں رہتے ہوئے، اپنے آپ کو لوگوں کا خیر خواہ (Well wisher) بنائے۔ وہ ایک کمزور انسان ہوتے ہوئے، ایک طاقتور انسان کا رول ادا کرے۔ وہ کامل آزادی کا مالک ہوتے ہوئے، اختیارانہ طور پر اپنے آپ کو سرینڈر کر دے۔ وہ نہ بولے ہوئے الفاظ کو سنے، اور نہ دکھائی دینے والی حقیقت کا اعتراف کرے۔ وہ جھوٹ سے بھری ہوئی دنیا میں سچ بولنے کا ثبوت دے۔ وہ بددیانتی (Dishonesty) کے ماحول میں دیانتداری (Honesty) کے رویہ پر قائم رہے۔

خدا کے فرشتے دن رات سرگرم ہیں کہ وہ ان لوگوں کی فہرست تیار کریں جو آخرت میں خدا کے پڑوس میں بننے والے جنت میں داخلے کے مستحق قرار پائیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کی اعلیٰ معرفت نے ان کو اس قابل بنایا کہ انہوں نے ہر دوسری چیز سے اپنی توجہ ہٹا کر صرف ایک خدا کو پانا سپریم کنسرن (Supreme Concern) بنالیا جن کا حال یہ تھا کہ ان کے شوقِ جنت نے ان کے لیے دنیا کی ہر پرکشش چیز کو بے کشش بنا دیا۔ خدا کی عظمت (Glory of God) کے احساس نے جن کے اندر سے فخر (Pride) اور بڑائی کے تمام جذبات کو مٹا دیا۔ خدا کی پکڑ کے اندیشے نے جن کا یہ حال کیا کہ لذتوں کے درمیان رہتے ہوئے، لذتوں سے محظوظ ہونا ان کے لیے ممکن نہ رہا۔

جن لوگوں کا حال یہ ہوا کہ جو آوازیں دوسروں کے لیے قابل سماعت آوازیں تھیں، وہ ان کے لیے ناقابل سماعت آوازیں بن گئیں۔ جن کو دنیا کی ترقی اور دنیا کی محرومی، دونوں یکساں طور پر بے معنی نظر آنے لگیں۔ جن کا حال یہ تھا کہ اپنے آپ کو صحیح ثابت کرنے کے بجائے، ان کے لیے یہ کہنا زیادہ محبوب بن گیا کہ۔۔۔ میں غلطی پر تھا۔

I was wrong

جنت ایک حقیقی مقام ہے۔ وہ حقیقی اوصاف کی قیمت ہی پر کسی کو حاصل ہو گا۔ جنت میں وہ انسان بسائے جائیں گے جو ربانی اوصاف کے حامل ہوں۔ جو لوگ موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو ان ربانی اوصاف کا حامل بنائیں، وہی وہ لوگ ہیں جو جنت میں بسائے جانے کے قابل ٹھیریں گے۔ جنت کسی کو پراسرار اسباب کے تحت نہیں ملے گی، بلکہ وہ کامل طور پر معلوم اسباب کے تحت ملے گی۔ اور وہ معلوم اسباب یہی ہیں کہ موجودہ دنیا میں آدمی اپنے آپ کو ان ربانی اوصاف کا حامل بنائے۔

جنت سچے انسانوں کی کالونی ہے۔ موجودہ دنیا میں انہیں سچے انسانوں کا انتخاب (Recruitment) کیا جارہا ہے۔ موجودہ دنیا کی زندگی میں جو لوگ کامل طور پر سچے انسان ثابت ہوں، وہی جنت کی ابدی دنیا میں بسائے جانے کے قابل ٹھیریں گے۔

جنت کا ٹکٹ

مغربی دنیا کے ایک سفر میں میری ملاقات ایک مسلمان سے ہوئی۔ ان کی عمر پچاس سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ انہوں نے کہا کہ مجھ کو تو جنت کا ٹکٹ چاہیے، مجھ کو آپ صرف یہ بتائیے کہ جنت کا ٹکٹ کیا ہے۔

میں نے کہا کہ معروف معنوں میں جنت کا کوئی ٹکٹ نہیں۔ یہ جنتی ٹکٹ کا معاملہ نہیں، یہ جنتی شخصیت کا معاملہ ہے۔ آخرت کی قیمتی جنت اس آدمی کو ملے گی جس نے اپنے اندر جنتی شخصیت کی تعمیر کی تھی۔ جنت میں داخلہ کسی کو "ٹکٹ" کے ذریعے نہیں ملے گا، جنت کی قیمت آدمی کا اپنا وجود ہے۔ اپنے وجود کی قیمت دے کر ہی کوئی شخص جنت کی دنیا میں اپنے لیے داخلہ پا سکتا ہے۔

جنت میں داخلے کی شرط یہ ہے کہ آدمی مزکی شخصیت (سورہ طٰہ، 76) لے کر وہاں پہنچا ہو، یعنی وہ ایک ایسا انسان ہو جس کے اندر پاکیزہ روح بسی ہوئی ہو، جس کا دل اور دماغ آلائشوں سے پاک ہو، جس نے اپنے اندر ربانی شخصیت کا باغ اگایا ہو۔ موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جس کے ایک طرف کیچڑ ہے اور دوسری طرف صاف وشفاف پانی، آدمی چاہے تو اپنے کو کیچڑ میں آلودہ کرے اور چاہے تو صاف پانی میں نہا کر وہ صاف ستھرا بن جائے۔ جو لوگ اپنے آپ کو آلودہ کریں، وہ آخرت میں جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔ اور جو لوگ اپنے آپ کو پاک کریں، ان کو جنت کی ابدی نعمت گاہوں میں بسایا جائے گا۔

اعتراف کے موقع پر اعتراف کرنا، اپنی شخصیت کو پاک کرنا ہے اور اعتراف کے موقع پر بے اعترافی کا رویہ اختیار کرنا، اپنی شخصیت کو آلودہ کرنا۔ اسی طرح ایک موقع آتا ہے جس میں ایک شخص اعلیٰ اخلاق کا ثبوت دیتا ہے اور دوسرا شخص پست اخلاق کا۔ ایک موقع آتا ہے جس میں ایک شخص حق تلفی کرتا ہے اور دوسرا شخص حق رسانی۔ ایک موقع آتا ہے جس میں ایک شخص امین (Honesty) ثابت ہوتا ہے اور دوسرا شخص خائن (Dishonest)۔ ایک موقع آتا ہے جس میں ایک شخص تواضع (Modesty) کے راستے پر چلتا ہے اور دوسرا شخص سرکشی کے راستے پر۔ ان میں سے پہلا آدمی اپنی شخصیت کو پاک کرنے والا ہے اور بلاشبہ جنت کی نفیس دنیا میں ایسے ہی مزکی انسانوں کو داخلہ ملے گا۔ اس کے برعکس، دوسرا آدمی اپنی شخصیت کو آلودہ کرنے والا ہے اور جہنم بلاشبہ ایسے ہی غیر مزکی لوگوں کا ٹھکانہ ہوگا۔

پندرہ بلین سالہ منصوبہ

سائنٹفک اکاؤنٹ کے مطابق، تقریباً پندرہ بلین سال پہلے، خالق کے حکم سے خلا (Space) میں ایک بڑا کاسمک بال وجود میں آیا۔ اس میں وہ تمام اجزا (Particles) موجود تھے جو آج ہماری کائنات کا حصہ ہیں، خالق کے حکم سے اس عظیم گولے میں ایک انفجار (Explosion) ہوا۔ اس انفجار کو عام طور پر بگ بینگ (Big Bang) کہا جاتا ہے۔

کاسمک بال میں انفجار کے بعد اس کے تمام اجزا وسیع خلا میں پھیل گئے، اس کے بعد خالق کے پلان کے مطابق، وہ مختلف صورتوں میں مجتمع ہونا شروع ہوگئے۔ ان ذرات کے اجتماع سے ان گنت ستارے بنے، کہکشائیں بنیں، ڈارک میٹر بنا، سولر سسٹم بنا، اس طرح بتدریج وہ پوری دنیا وجود میں آئی جس کو ہم کائنات (Universe) کہتے ہیں۔

اس کے بعد خالق نے سیارہ زمین (Planet earth) کو اپنے خصوصی پلان کو بروئے کار لانے کے لیے منتخب کیا۔ لمبی مدت کے عمل کے بعد سیارۂ زمین ٹھنڈا ہوا۔ خالق کے حکم سے یہاں پانی بنا، بارشیں ہوئیں اور دریا اور سمندر وجود میں آئے، سیارۂ زمین کا تقریباً تین چوتھائی حصہ پانی سے بھر گیا۔ اس کے بعد خالق کے منصوبے کے مطابق، سیارۂ زمین پر سبزہ اگا اور زمین کی خشکی کا حصہ ہرے بھرے درختوں اور جنگلوں سے بھر گیا۔

اس کے بعد زمین پر خالق کے خصوصی پلان کے مطابق، اس کا اگلا حصہ ظہور میں آیا۔ یعنی حیوانات کی دنیا وجود میں آئی۔ بے شمار قسم کے جانور، مچھلیاں، چڑیاں چوپائے اور طرح طرح کی ذی حیات اشیاء سے زمین بھر گئی۔

خالق کے منصوبے کے مطابق اس کا اگلا مرحلہ یہ تھا کہ یہاں انسان کو پیدا کر کے سیارۂ زمین پر اس کو بسایا جائے۔ چنانچہ انسانِ اول کے طور پر آدم اور ان کی بیوی حوا کو پیدا کیا گیا۔ پھر اس پہلے جوڑے سے انسانی نسل چلی، یہاں تک کہ زمین کے مختلف حصوں میں انسان کی آبادیاں قائم ہو گئیں۔

اس کے بعد خدا کے منصوبے کا ایک اور حصہ ظہور میں آیا۔ یہ پیغمبروں کا پیدا ہونا تھا۔ زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کے درمیان خالق نے اپنے پیغمبر بھیجے یہ تمام پیغمبر انسان تھے۔ خالق نے ان کو خصوصی طور پر اس لیے بھیجا کہ وہ انسانوں کو ان کی قابل فہم (Understandable) زبان میں یہ بتائیں کہ ان کے بارے میں خالق کا تخلیقی پلان (Creation Plan) کیا ہے۔

پیغمبروں کی آمد کا یہ سلسلہ لمبی مدت تک چلتا رہا۔ پہلے انسان، آدم خود بھی ایک پیغمبر تھے۔ اس کے بعد ہر نسل میں پیغمبر آتے رہے۔ مثلاً حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور آخر میں پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد ﷺ۔

پیغمبروں کے ذریعے خدا نے ہر نسل کے انسانوں کو بتایا کہ موجودہ دنیا سلیکشن گراؤنڈ کے طور پر بنائی گئی ہے۔ انسان کی آبادکاری کی اصل اور ابدی جگہ تو جنت ہے۔ جنت ابدی بھی ہے اور ہر اعتبار سے آئیڈیل بھی۔ مگر جنت میں داخلہ صرف انتخابی بنیاد (Selective Basis) پر ہو گا۔

موجودہ دنیا میں خالق کی طرف سے غیر مرئی (Invisible) ریکارڈنگ کا نظام عالمی پیمانے پر قائم کیا گیا ہے۔ اس نظام کے تحت، ہر عورت اور ہر مرد کے قول و عمل کا مسلسل ریکارڈ تیار کیا جا رہا ہے۔ یہ ریکارڈ قیامت کے دن سامنے آ جائے گا۔ پھر لوگوں کے اعمال کے ریکارڈ کے مطابق ان افراد کو منتخب کیا جائے، جو اپنے عمل کے اعتبار سے جنت کی کامل دنیا میں بسائے جانے کے اہل ثابت ہوں گے۔ بقیہ لوگوں کو چھانٹ کر انھیں کائنات کے کوڑا خانے میں ڈال دیا جائے گا، تاکہ وہ ابدی طور پر محرومی اور حسرت کے عذاب کو بھگتتے رہیں۔

خالق نے چاہا کہ وہ کچھ منتخب لوگوں کو اپنے اس خصوصی انعام سے نوازے کہ وہ جنت کی معیاری دنیا میں ہر قسم کی لذت اور مسرت کے ماحول میں ابدی طور پر آباد رہیں، اور اپنی ہستی کے کامل تکمیلیت (Fulfilment) کا تجربہ کریں۔ یہ خالق کی خصوصی طور پر دی ہوئی ایک انوکھی

رحمت ہوگی، جو صرف منتخب قسم کے کچھ خوش قسمت لوگوں کے حصے میں آئے گی۔

خالق نے چاہا کہ وہ چمتکار کے طور پر اس دنیا کو پیدا نہ کرے، بلکہ وہ پوری طرح اسباب وعلل کے ذریعے اس کو وجود میں لائے۔ حضرت موسیٰ، خدا کے پیغمبر تھے، انہوں نے ایک لکڑی زمین پر ڈالی اور خدا کے حکم سے وہ ایک زندہ سانپ بن گئی۔ خدا چاہتا تو اسی طرح پوری کائنات کو اچانک معجزاتی طور پر پیدا کر دیتا۔ مگر ایسا کرنے کی صورت میں انسان کے اندر تخلیقیت (Creativity) کا ارتقا نہ ہوتا۔ نہ سائنس بنتی اور نہ تہذیب وجود میں آتی۔ اس لیے خالق نے کائنات کو ایک لمبے پراسس (Process) کے روپ میں پیدا کیا، تا کہ انسان اپنی سوچ کو عمل میں لائے اور ذہنی ارتقا کے اعلیٰ درجے تک پہنچ سکے۔ یہ ایک لمبا منصوبہ تھا، چنانچہ اس کی تکمیل میں تقریباً 15 بلین سال گزر گئے۔

قرآن میں بار بار یہ بات کہی گئی ہے کہ آسمان اور زمین اور اس کی تمام چیزیں انسان کے لیے بنائی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو کائنات کی تخلیق کا 15 بلین سالہ منصوبہ گویا صرف انسان کے لیے تھا۔ اب انسان سے کیا مطلوب ہے، وہ صرف ایک چیز ہے، اور وہ ہے معرفت الٰہی۔ انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ تخلیق میں غور و فکر کرکے خالق کی معرفت حاصل کرے۔ یہی معرفت، جنت کی قیمت ہے۔ معرفت کا یہ عمل کوئی محدود عمل نہیں۔ وہ موجودہ دنیا میں شروع ہوتا ہے اور آخرت کی دنیا تک جاری رہتا ہے۔ یہ ایک ابدی عمل ہے جس کا آغاز تو معلوم ہے لیکن اس کی انتہا (end) معلوم نہیں۔ معرفت کے حصول کا عمل دنیا میں ابتدائی طور پر جاری ہوتا ہے اور آخرت میں وہ اپنی انتہائی صورت میں جاری رہے گا۔ یہی معرفت انسان کا اصل امتیاز ہے۔ یہی معرفت، انسان کو جنت میں داخلے کا مستحق بناتی ہے۔ یہی معرفت کسی انسان کے لیے اس انعام کا سبب بنے گی کہ اس کو خداوند ذوالجلال کے قریب مقعد صدق (سورہ القمر، 55) میں جگہ ملے۔

موجودہ گلوبل وارمنگ، خالق کی طرف سے اس بات کا الارم ہے کہ تخلیق کا پہلا مرحلہ ختم ہوچکا، یعنی افراد کے انتخاب کا مرحلہ۔ اب خالق کائنات غیب کا پردہ پھاڑ کر سامنے آجائے گا۔ وہ کامل انصاف کے مطابق لوگوں کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کرے گا۔ اب آخری وقت آگیا ہے کہ انسان جاگے اور تیاری کرکے اپنے آپ کو اس قابل بنائے کہ قیامت کے بعد بننے والی اگلی دنیا میں وہ ابدی جنت میں جگہ پا سکے۔
